لال قلعہ کی ایک جھلک
مصنفہ سید ناصر نذیر فراق دہلوی

LYTTON LIBRARY
ALIGARH
MUSLIM UNIVERSITY

مجلہ حقوق بحق ساقی بک ڈپو دہلی محفوظ

دزمانہ جنگ کا ایڈیشن

لال قلعہ کی ایک جھلک

مصنفہ

حکیم خواجہ سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی

جانشین خواجہ میر درد رح

ناشر:

ساقی بک ڈپو دہلی

(مطبوعہ محبوب المطابع دہلی)

بار سوئم ※ قیمت ایک روپیہ چار آنہ

۸۹۱۵۴۳۵
۱۱۳۴۶

دیباچہ

سُن کر مرا فسانہ اُنہیں لطف آ گیا   سُنتا ہوں اب کہ روز طلب قصّہ خواں کی ہے

ہمارے خواجہ محمد نصیر صاحب شیخ کی ایک بیوی زن مرید تھیں جن کا نام احمدی خانم تھا۔ ان کی کوکھ سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جن کا نام ننھی خانم رکھا گیا۔ جب ننھی خانم بارہویں برس میں پڑیں تو اُن کی ماں نے اُنہیں حضرت کا مرید کروا دیا اور جب چودہ برس کی ہوئیں تو مشاطہ اُن کی منگنی کا رُقعہ لائی۔ احمدی خانم نے رُقعہ رکھ لیا اور مشاطہ سے کہہ دیا میں یہ رُقعہ اپنے پیر و مرشد کو دکھاؤں گی اگر حضرت پسند کریں گے تو میں بھی منظور کر لوں گی تم آج ہی کے دن آنا اور ہاں، ناں کا جواب لے جانا۔ احمدی خانم حضرت کی خدمت میں آئیں اور رُقعہ آپ کو دکھایا۔ رُقعہ میں لکھا تھا "بندہ کا نام رسول بخش ہے۔ میری والدہ حضرت ظل اللہ ابوظفر بادشاہ دہلی کے زنانہ محل میں باورچی خانہ کی بکاولی ہیں اور سال دن میں دو بار بادشاہ کی زیارت سے مشرف ہوتی ہیں میرے نام و نسب چال چلن کی پوچھ گچھ کرنی ہو تو

لال قلعہ میں کر لی جائے۔" حضرت رُقیہ کو سُن کر مُسکرائے اور فرمایا "جس کے ہاتھ ہنڈیا
ڈوئی اُس نے سب کوئی، میاں خدا بخش کی ماں محل کے باورچی خانہ کی داروغہ ٹھیریں
اُن کی تو ہر وقت پانچوں گھی میں رہتی ہوں گی، مجھ کو نہیں آنکھ بند کر کے بیٹی دیدو۔"
اس قصہ کو سو برس ہونے آئے کیونکہ ننھی خانم بیاہ کے تیسرے دن جب حضرت
کے سلام کو بارہ دری میں آئیں تو فقیر فراق کی والدہ صاحبہ چار برس کی تھیں۔
اُن کے دُلہناپے کے لال کپڑوں کو دیکھ کر میری والدہ صاحبہ نے اپنی نانی صاحبہ سے
جو خواجہ میر درد صاحب کی پوتی تھیں پوچھا کہ "یہ لال کپڑوں والی کون ہیں" انہوں نے
فرمایا "یہ بی دلہن ہیں" اُس دن سے جب تک ننھی خانم جیتی رہیں۔ اور غالباً اسّی
نوّے برس جئیں۔ میری والدہ انہیں بی دُلہن کہتی تھیں۔ فقیر فراق عرض کرتا ہے
کہ میں نے بی دُلہن کو ۱۲۹۲ھ اور ۱۲۹۳ھ ہجری میں دیکھا ہے۔ بڑھاپے کے مارے
سوکھ کر چھوہارا ہو گئیں تھیں، پھونس تھیں، میری عمر اُس وقت چھ سات برس سے
زیادہ کی نہ تھی، ہم سب بہن بھائی انہیں نانی دُلہن کہتے تھے۔ اُن کے مُنہ سے
بہت سی کہانیاں اور لال قلعہ کے بہت سے حالات سُنے ہیں، مجھے بی خانم
صاحبہ کی باتیں سمجھنے کی استعداد اُس وقت نہ تھی کیونکہ چھ سات برس کی
عمر کیا استعداد رکھتی ہے۔ مگر یہ یاد ہے کہ میری والدہ کو حضرت بی بیگم صاحب
کہتی تھیں، ماتھا چوم کر بات کرتی تھیں، لال قلعہ اور بادشاہ کے کچھ حال
بیان کرتی تھیں تو اُن کی ایک آنکھ ساون اور ایک بھادوں بن جاتی تھی۔ سسکیاں

ٹھہرتی جاتی تھیں اور باتیں کرتی جاتیں تھیں۔ دلّی کو کبھی شاہجہاں آباد اور کبھی اُجڑا دیار کہتی تھیں، بادشاہ کو سوائے جہاں پناہ اور حضور کے اور کسی لفظ سے یاد نہ کرتی تھیں۔ بات کو "سخن" کہتی تھیں بادشاہ کے ہزاروں شعر انہیں حفظ تھے۔ آپ مرحومہ کے ملفوظات ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں تا کہ انہیں پڑھکر عبرت کا سبق حاصل ہو۔

ناصر نذیر فراق دہلوی!

لال قلعہ کی ایک جھلک

فرماتی تھیں "میری ساس بڑی تُنک مزاج، چڑچڑی بڑبڑ بولی تھیں، اور شاہی محلوں میں ہروقت رہنے سے ستھرائی اُن کے اندر حد سے زیادہ آگئی تھی۔ ہر روز سفید جوڑا صبح ہی بدل کر موسم کے موافق عطر مل لیتی تھیں کیونکہ جہاں پناہ کسی کام کے لئے یاد فرماتے تھے تو بالکل پاس جاکر کھڑا ہونا پڑتا تھا، اور اندیشہ رہتا تھا کہ باورچی خانے کے دھوئیں کی بُو کپڑوں میں نہ بس جائے اور جہاں پناہ کا دماغ پریشان ہو۔ ایک دن میں اپنی سسرال میں کمرہ کے اندر سنگار کر رہی تھی۔ جب کنگھی چوٹی مسّی لاکھے سے فارغ ہوئی تو باہر آگئی۔ اتفاقاً میرے سر کا ایک بال جو کنگھی سے ٹوٹا تھا، چاندنی پہ پڑا رہ گیا۔ ساس جو کمرے میں گئیں تو وہ بال اُن کی نظر پڑ گیا۔ دیر تک اُسے گھورتی رہیں اور ناک پر اُنگلی رکھ کر بولیں "اے اوئی! دُور پار! یہ میرے سر کا بال نہیں، میاں خدا بخش کے سر کا بال نہیں، یہ تو کسی گھوڑے کی دُم کا بال معلوم ہوتا ہے، اتنا موٹا رستا ہے کوچ کچھو تو پن بھی کیا بھدا ہوتا ہے۔" میں سمجھ گئی کہ یہ طعن ضرور میرے اُوپر ہو رہے ہیں مگر میں نے دم نہیں مارا۔ (۲۰)

کان سُنا، اُس کان اُڑا دیا۔ چھ مہینے بعد میرے میاں کی اجازت سے مجھے لال قلعہ
لے جانے لگیں، میں نے دیکھا جہاں پناہ جب کھانے کے کمرے میں دسترخوان پر
تشریف فرما ہوتے تو خاصہ کھانے کے لئے ملکہ زمانی حضور والا کے پہلو میں اور
جن جن بادشاہزادوں اور شاہزادیوں کو آپ یاد کرتے وہ بھی اِدھر اُدھر دسترخوان
پر حاضر ہوتیں۔ دُنیا کی نعمتیں دسترخوان پر چُنی جاتی تھیں مگر جہاں پناہ سوائے
بٹیر کے شوربے کے اور کچھ نوش نہ فرماتے تھے۔ اپنی آل اولاد کو کھاتا دیکھ کر
فرماتے "ان سب کے منہ میرے ہی منہ اور ان سب کے پیٹ میرے ہی پیٹ ہیں،
یہ کھاتے ہیں اور میں خوش ہوتا ہوں"۔ کسی بادشاہزادے یا بادشاہزادی
کی تاب و طاقت نہ تھی جو دسترخوان پر بات کیا ہُوں بھی کرسکے۔ کمرہ کے
دروازوں پر چلمنیں پڑی ہوتی تھیں۔ چلمن کے باہر میری ساس اور باورچنیں ہاتھ
باندھے کھڑی ہوتی تھیں، اگر جہاں پناہ کو کسی کھانے کے متعلق کچھ کہنا سُننا ہوتا
تو اشارہ فرماتے "داروغہ کو بلاؤ"۔ میری ساس چلمن سرکا کر کمرے میں داخل
ہوتیں اور آداب بجا لاتیں۔ فرماتے "ہاں ایک خوان خاصہ کا ملکہ کے ہاں، ایک
خوان خاصہ کا ڈھک کے ہاں، ایک خوان حکیم صاحب کے ہاں، آٹھ خوان خاصہ
کے حضرت میاں کالے صاحب کے ہاں جائیں گے"۔ میری ساس ہاتھ جوڑ کر عرض
کرتیں "کرامات حضور کے اقبال سے خوان تیار ہیں، بہنگیوں میں رکھوا کر ابھی
بھجوائے دیتی ہوں"۔ رفتہ رفتہ محلسرا کی بیگمیں اور زادیاں مجھے جاننے لگیں کہ یہ

داروغہ کی بہو ہے، جہاں پناہ بھی مجھے پہچانتے تھے کہ یہ بکاول کی بہو ہے۔ اور کارخانہ
کام میں اُس کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ یہ زنانہ باورچی خانہ کے انتظام کا ذکر ہوا۔ بڑا
باورچی خانہ تو مردانہ میں تھا جس میں بہت سے مرد باورچی اور رکابدار کام
کرتے تھے۔ مگر اس باورچی خانہ کا کھانا بھی محلسرا ہی میں آجاتا تھا۔

جہاں پناہ جس طرح شعر و سخن میں نئی نئی باتیں نکالتے تھے اُسی طرح کھانوں
اور مٹھائیوں میں نت نئی ایجاد کرتے تھے، مثلاً مرچوں کا حلوہ، کریلے کا حلوا اور
جس طور سے جہاں پناہ ہم لوگوں کو تعلیم کر دیتے تھے، ہم لوگ پکا بھی اسی طرح
لیتے تھے اور انعام پاتے تھے۔

جب شاہجہاں آباد میں مومی چھینٹ پہلی بار آئی، اور حضور والا کی نظر سے
گزری تو آپ کو بہت اچھی معلوم ہوئی۔ آپ نے اُس کا پیجامہ بنوا کر پہنا اور جشن
منایا اور سب نے مومی چھینٹ کے استعمال کرنے کی مبارک باد دی۔ اب مومی
چھینٹ کو نیچ قومیں بھی پسند نہیں کرتیں۔ مگر فراق ؎

تم جسے چاہو چڑھا لو سر پر　　　دوش نوش دوش پہ کامل ٹھہری

برسات کی رُت میں جہاں پناہ مہرولی تشریف لے گئے شمسی تالاب کے کنارے

ڈیرے خیمے لگے ہوئے تھے، زنانہ سراپردہ الگ تھی، مردانہ بارگاہ جدا کھڑی
تھی، بچھیرا پلٹن بھی ساتھ تھی، شمسی تالاب میں بادشاہی بجرے، نواڑے ناویں
پڑی ہوئی تھیں، تالاب برسات کے پانی سے کٹورے کی طرح پڑا چھلک رہا تھا۔
جھرنا جھر رہا تھا۔ آمریوں میں جھولے پڑے ہوئے تھے کھم گڑے ہوئے تھے کڑاہیوں
میں پکوان تلے جا رہے تھے، بادشاہ زادیاں جھولا جھول رہی تھیں، مور جھنگا
رہے تھے، پپیہے پی کو پکار رہے تھے، ملار گائے جاتے تھے، گیت اونچے سروں
میں اٹھائے جاتے تھے، ایک طرف سے صدا آ رہی تھی۔

"اماں میرے باوا کو بھیجو جی کہ ساون آیا"

دوسری جانب سے کانوں میں آواز گونج رہی تھی۔

"ماں ایک کریلا میں بویا بھابی نے کہیو توڑے نا"

زنانہ باورچی خانہ بھی ساتھ گیا تھا۔ میری ساس اور ان کے ساتھ میں بھی تھی،
ایک چھوٹا سا خیمہ ہمیں دیا گیا تھا، ایک روز جب حضور والا اور خاص خاص
بیگمیں دوپہر کا کھانا کھا کر آرام کرنے لگیں تو میں خیمہ کی انگنائی میں کچھ سینا
پرونا لے کر بیٹھ گئی۔ بقچی کھولی تو دیکھا کہ قینچی کو زنگ لگ گیا ہے، سوئیاں بھی
سب زنگ کھائی ہوئی ہیں۔ ایک سوئی کو ایک پتھر کی سِل سے جو انگنائی میں
ہزاروں پتھروں اور اینٹوں میں پڑی ہوئی تھی گھسنا شروع کیا، سوئی آناً فاناً
میں صاف ہو کر چمکنے لگی، میں نے اس میں دھاگا پرو کر سینا چاہا تو سوئی کپڑے

میں جا کر ٹیڑھی ہو گئی، میں نے پھر اُسے سیدھا کیا اور پھر ٹانکہ بھرا تو ابکے وہ دوہری ہو گئی۔ تنگ ہو کر میں نے اُس سوئی کو رکھ دیا اور دوسری سوئی سے سینے لگی۔ اتنے میں میری ساس ظہر کی نماز پڑھ کے خیمہ سے باہر آئیں تو میں نے کہا۔ "اماں جان کیا تماشہ ہے، سُوئی پتھر رگڑنے سے پیتل کی ہو گئی"۔ میری ساس نے سُوئی ہاتھ میں لے کر دیکھی اور کہا "رکھ لو، جہاں پناہ قیلولہ سے اُٹھیں گے تو حضور میں پیش کریں گے"۔ تین بجے اُٹھ کر جہاں پناہ نے ظہر کی نماز ادا کی میری ساس تسبیح خانہ میں گئیں اور جہاں پناہ کے سامنے سُوئی رکھ دی اور ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئیں، جہاں پناہ نے فرمایا "ہوں"۔ میری ساس نے سُوئی کا قصہ بیان کیا۔

جہاں پناہ:- "اماں یہ سُوئی سونے کی ہو گئی اور وہ پارس پتھر تھا جس نے اسے سونا بنا دیا۔ اچھا بتاؤ تمہارا ڈیرہ کتنی دور ہے؟"

میری ساس:- "قربانت شوم۔ بہت پاس ہے"۔

حضور والا اور زینت محل قنات قنات میرے ساتھ ہوئیں۔ لیبا دلنی اُڑتی ہوئی ہمارے خیمہ کی طرف بڑھی اور چلا کر کہتی چلی گئی "خبردار! خبردار جہاں پناہ تشریف لاتے ہیں"۔ اس صدا کو سن کر میں نے اپنے تئیں اپنے دوپٹے سے اوڑھ لپیٹ لیا اور سر جھکا کر ادب سے کھڑی ہو گئی، میں نے دیکھا کہ حضور کے سر پر چار گوشے کا مغلیہ تاج ہے، ہاتھ میں زمرد کی تسبیح ہے اور پاؤں میں کفش پائی ہے۔

جس کے کھرے نگینے چمک دمک رہے ہیں، ہماری قنات میں حضور آ گئے تو میں نے آداب بجایا۔ میری ساس نے کہا: "کرامات لونڈی کی بہو یہی ہے اور اسی کے ہاتھ میں لوہے کی سوئی سونے کی ہو گئی ہے۔"

حضور والا کو ساری عمر میں آج میں نے سر کھڑے ہو کر دیکھا تھا، میں رعب کے مارے تھر تھر کانپ رہی تھی،

جہاں پناہ: "بیہودہ کنّل تو نے کہاں سے اٹھائی تھی؟"

میں بولنے میں جھجکی تو میری ساس نے مجھ سے کہا: "یہ ہمارے مائی باپ ہیں، کچھ حیا نہ کرو۔ اور حضرت کو ٹھیک ٹھیک جواب دو۔" آخر میں نے اپنے جی کو مضبوط کر کے حضور والا نے جو کچھ مجھ سے پوچھا وہ بتایا، حضور کے پیچھے زینت محل کھڑی تھیں جن کے ڈھیلے پائچوں کو چھ خواصیں سنبھال رہی تھیں ایک لونڈی کے ہاتھ میں حقہ تھا اور ایک لونڈی بیچوان کے چولڑہ کو تھام رہی تھی یاقوت کی منہال بیگم کے منہ سے لگی ہوئی تھی۔ بیگم نے حقہ کے دو تین ہی گھونٹ لئے ہوں گے جو خوشبو سے تمام خیمہ اور قنات معطر ہو گئی، خوجوں نے حضور والا کے حکم سے ایک ایک کنّل، ایک ایک بٹیہ، ایک ایک سنگریزہ اٹھا کر دیکھ ڈالا مگر پارس پتھر نہ ملنا تھا نہ ملا۔ جب حضور شاہ عالم خیر سے لال قلعہ پلٹ آئے تو وہ سوئی فرنگیوں کو دکھاتے تھے اور کہتے تھے "آپ صاحبان پارس پتھر اور کیمیا کے قائل نہیں، مگر تجربہ کہتا ہے کہ یہ چیزیں دنیا میں موجود ہیں گو کسی کو نہ ملیں۔

زنانہ بھنڈارخانہ کی داروغہ کے پاس ایک غریب عورت نوکر تھی، جو کوئلوں کا تھیلا اور تمباکو کا ڈبہ داروغہ کے ساتھ لئے پھرتی تھی، جس مقام پر جہاں پناہ تشریف فرما ہوتے تھے یہ عورت کسی آڑ کی جگہ بیٹھ کر چقماق سے آگ جھاڑ کر کوئلے روشن کر کے چلم پر رکھتی تھی، داروغہ جی حضور کا اشارہ پاتے ہی حقہ پر چلم رکھ کر حضور کے سامنے بھنڈا سجا دیتی تھی اور دوسری نوکر پہلا حقہ آگے سے اٹھا لیتی تھی، ایک دن حضور والا محل سے ہوادار میں بیٹھ کر لال قلعہ کے باغ کی سیر کرنے لگے، پھر باغ کی بارہ دری میں بیٹھ گئے، شام ہو چکی تھی، جمنا کے پانی میں شفق کے رنگ بہار دے رہے تھے، درختوں کی ٹہنیوں اور گنبدوں میں چھپ چھپ کر چڑیاں بسیرا لے رہی تھیں اور جنگلے کے کمروں میں جہاں پناہ کو مبارک باد دے رہی تھیں۔ جہاں پناہ نے اسی بارہ دری میں مغرب کی نماز پڑھی اور حقہ طلب کیا، داروغہ جی نے اِدھر اُدھر دیکھا تو تھیلے والی کو نہ پایا۔ جہاں پناہ کے ڈر سے وہ کانپ اٹھیں اور تھیلے والی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں ڈھونڈنے لگیں جو پیچھے سے آواز آئی۔ "داروغہ جی میں یہ رہی اور چلم بھی تیار ہے"۔ داروغہ جی کڑک گئیں اور تھیلے والی کے پاس گئیں۔

داروغہ جی۔ "چپکے سے، نگوڑی کہاں غارت ہو گئی تھی؟ موئی ہتنی کیسی دیو نی جیسی۔ بولتی نہیں کدھر مر گئی تھی؟"

تھیلے والی: "میں آپ کو باغ کے تختہ تختہ میں ڈھونڈتی پھرتی تھی، جو گولر کے درختوں

کے جھنڈ میں پہنچ گئی، یونہی جو میری نظر اوپر گئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ گولر کے پیڑ کی پھننگ پر پنکھ کے پاٹ برابر ایک چیز گول گول انگارہ کی طرح دہک رہی ہے۔ اُسے دیکھ کر میری آنکھوں میں چکا چوند آ گیا، میرا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے بھاگی ہوں تو یہاں آ کر دم لیا ہے، اللہ جانے کیا اسرار تھا!“

داروغہ جی: ”اسرار کیا تھا آج دوالی کی رات ہے گولر کا پھول اسی رات کو کھلا کرتا ہے۔ جس مرد کو دکھائی دے جاتا ہے وہ راجہ یا بادشاہ ہو جاتا ہے، اور جو عورت اُسے دیکھ لیتی ہے وہ رانی یا بادشاہ کی جورو بنتی ہے، اب تیرے نصیب جاگے، تو نے گولر کا پھول دیکھا، جہاں پناہ کے محل میں داخل ہوگی، سردار محل خطاب پائے گی، موتی جھوٹی لیاٹن......“

خبر نہیں گولر کا پھول دیکھا یا نہ دیکھا ہوا، چند ہی روز میں وہ جہاں پناہ کی منظورِ نظر ٹھہری اور بیگم بن گئی۔ سچ ہے جسے پیا چاہے وہی سہاگن۔

بادشاہ زادے اور بادشاہزادیاں مل کر عجیب عجیب باتیں کرتے تھے، ایک صاحب عالم فرماتے ”اوپے لفر جھٹ پٹ آدھی کی کٹنی آدھی کو دیر۔ دوسری طرف سے صدا آتی۔ ”ماموں جان آپ شادی کرتے ہیں یا لوٹا لوٹا؟“ ماموں صاحب: ”تم بھانجے جان کی میں جب کرتا ہوں ایسی ہی کرتا ہوں۔“

ایک بیگم کہتیں چھوٹے مرزا کہو تو یہی سیڑھی کی سل پر سونف سوکھنے کو رکھی ہے اسرک کر کھڑے ہو تو سایہ نہ پڑے۔" چھوٹے مرزا اس بات کو دہراتے تو ان کی زباں لڑکھڑاتی اور کچھ کا کچھ کہہ جاتے تو بڑی ہنسی ہوتی اور چھوٹے مرزا شرما جاتے۔

ایک بیگم اپنے بچے کو بہلاتیں تو کہتیں "روؤ نہیں، میں تمہیں جانِ آدم دکھاؤں گی۔" بچہ جانِ آدم کا نام سُن کر چُپ ہو جاتا اور کہتا اچھا حضرت جانِ آدم دکھائیں۔ بیگم لونڈی سے کچھ کان میں کہتیں، لونڈی دوڑتی ہوئی جاتی، اور تھوڑی دیر میں آ جاتی، چپکے سے کوئی چیز بیگم کی مٹھی میں دیدیتی۔ بیگم بچہ کو بہلانے کے واسطے کہتیں "جانِ آدم کیا اچھی شے ہے۔" بچہ کہتا "اماں حضرت خدا کے لئے جانِ آدم جلدی دکھلاؤ۔" بیگم مٹھی کھول دیتیں اور مٹھی میں سے دو دانے گیہوں کے نکل پڑتے۔ بچہ ٹھنک کر کہتا کہ "واہ یہ جانِ آدم ہے۔ یہ تو گیہوں کے دانے ہیں۔"

"بیٹا جانِ آدم یہی ہے۔ اس دانے کی خاطر حضرت آدم بہشت سے نکلے۔"

مداری بھی چوک میں بیٹھ کر لڑکوں کو یہی جانِ آدم دکھلایا کرتا تھا۔

باہر کی ایک بیگم علاج کے لئے شاہجہاں آباد میں آئیں میری سسرال کے محلے میں کرایہ کا مکان لیا۔ باہر والیاں کبھی میں نے سینکڑوں دیکھی تھیں گنواریاں

بھی ہزاروں نظر سے گذری تھیں۔ مگر یہ اپنے نام کی نرالی ہی تھیں۔ مزاج کی ایسی تندی
کہ خدا کی پناہ۔ ناک پر غصہ رکھا رہتا تھا۔ بیچاری لونڈیوں کو دل دل مارتی تھیں ہر
وقت تیہہ چڑھا رہتا تھا۔ بی دولتی آپ ہی آپ کھولتی۔ ایک دن اپنی لونڈی سے
بولیں جس کا نام شہزادی تھا: "اری شہزادی! منشی جی سے کہہ دینا نسخے میں
جو حکیم جی نے دوا لکھی ہے وہ مت لایا کریں اس میں مجھے چکوندر کی باس
آوے ہے۔ کھاتی ہوں تو ابکائیاں لیتے لیتے باؤلی ہو جاؤں ہوں چکوندر کی بو شہر
والوں کو ہی اچھی لگتی ہوگی اور منشی جی سے کہہ دینا ترکاری چکوندر (چقندر) بھی
نہ منگوایا کریں، مجھے زہر لگیں ہیں"۔ سقہ جب پانی کی مشک لے کر محل میں آیا
تو پہلے ڈیوڑھی میں ٹھہر کر آواز دیتا "پانی لاتا ہوں حضرت پانی لاتا ہوں حضرت"
اس حضرت کے کہنے پر بیگم بہت جھلّائیں۔ آخر اُن سے ضبط نہ ہو سکا ایک دن
وہ پانی لے کر آیا تو لونڈی سے فرمایا "سقّے سے کہہ دے تو دروازہ پر کھڑا ہو کر حضرت
حضرت کیا کرتا ہے، حضرت کو مرے ہوتے بارہ سو برس ہوئے، حضرت یہاں کہاں
سے آئے"۔ دلّی کا سقہ وہ سمجھ گیا اور یہ کہتا چلا گیا "بیگم صاحب نے سچ کہا اب
اس ڈیوڑھی پر آکر حضرت کبھی نہ کہوں گا"۔ سقہ گیا اور دھوبن کپڑے لے کر آئی
کپڑے ملاحظہ سے گذر چکے تو فرمانے لگیں "شہزادی! روٹی کے سوکھے ٹکڑے
بہت سے رکھے ہوئے ہیں لا کر اس دھوبن کو دیدے یہ اور اس کے بال بچے
کھالیں گے"۔

دھوبن :- ادئی بیوی سات قرآن درمیان اس بندی پر اور اُس کے بال بچوں پہ ایسی کیا بپتا پڑی ہے جو سوکھے ٹکڑے چبائیں گے۔ خدا کا فضل ہے ہم تو اچھی سے اچھی نعمتیں کھاتے ہیں۔ کل ہی میری برادری میں بیاہ رچا تھا، کونڈا بھرا تنجن رکھا ہے، آپ کو یقین نہ ہو تو دکھانے کے لئے ایک قاب بھر لاؤں "

بیگم صاحب دھوبن کی ان باتوں کو سُن کر بہت جھینپیں اور کہنے لگیں "تو ٹکڑے لیجا اپنے بیل کو کھلا دیجیو "

دھوبن :- "نہیں حضرت، نوج۔ میرا بیل سوکھے ٹکڑے کھائیگا تو اُس کے پیٹ میں درد نہ ہو جائے گا "

اُن کے میاں شاہجہاں آباد والوں کی اداؤں پر مٹے ہوئے تھے، وہ علاج کے بہلانے سے اُسے تمیز سکھانے کے لئے شاہجہاں آباد لائے، اُسے تنہائی میں سمجھایا کرتے تھے۔

"بیوی تم بھی شاہجہاں آباد والوں کی طرح بولا کرو، ان کی باتیں سیکھو، اُن کا جیسا لباس پہنو "

بیگم :- "اجی بس رہنے بھی دو۔ خدا ان دلی والیوں سے بچا دے، بڑی بے شرم بڑی بے حیا، گھر والیاں تو معلوم ہوتی نہیں کنچنیاں معلوم ہوتی ہیں، کھڑی بولی جیسے مرد بات چیت کرتے ہیں "جناب اور حضرت تشریف لائیے" میں سادی مرگ ہو جاؤنگی "۔ ایمان کیسو، میرے تو کبھی سمجھ میں نہ آئی کہ سادی مرگ کون بیماری ہے دلی

والیوں کو ہی ہوتی ہوگی۔"

نواب صاحب نے ایک ماما دلّی کی بھی نوکر رکھ لی تھی، وہ دن رات نواب صاحب کے ہاں رہتی تھی، اور بیگم صاحب اور نواب صاحب کی باتیں سُن سُن کر یاد کرلیتی تھی اور موقع پاکر مجھے سُنا دیتی تھی۔

ایک دفعہ رات کا وقت تھا، بیگم اور نواب صاحب کے پلنگ انگنائی میں برابر برابر بچھے ہوئے تھے آپ کی بیگم بولیں۔" اے سہجادی! سہجادی! سال لالاہ لالا، لا، پا پوس لا، نسی جی کی دیوال تلے موتن جاؤں ہوں"

ایک بیگم کے محل میں صبح ہی ایک سُنار کا لڑکا جس کی عمر تیرہ چودہ برس سے زیادہ نہ تھی، چھوٹی سی نہائی، سنسی، ہتوڑی اور اسی قسم کے چند اوزار لیکر آجاتا تھا اور ایک طرف بیٹھ جاتا تھا۔ بیگم اپنا صندوقچہ کھولتیں اور اُس میں سے خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کوئی سیر بھر سونے کا جڑاؤ گہنا اُس سُنار کے لڑکے کے حوالے کرتیں اور فرماتیں۔"بیٹا نگینے سونے سے اس طرح الگ کرنا کہ کوئی نگینہ گرے نہیں، موتی کرچ نہ جائے، نہیں یاد رکھنا تیرے کان اینٹھونگی۔" سُنار کا لونڈا ہاتھ جوڑکر عرض کرتا کسی نگینے پر کھرنچ نہ آئے گی، پھر وہ اپنے ٹھیئے پر بیٹھ جاتا اور نگینے گہنے سے الگ کرلیتا، اور ایک طشتری میں رکھ کر وہ نگینے اور ایک رکابی میں رکھ کر سونے کا بگڑا ہوا زیور بیگم صاحب کے سامنے لاتا۔ بیگم بہت بے پرواہی سے کہتیں

"گل چہرہ! یہ نگینے جواہر خانے کے داروغہ کو سونپ دے" اور سونے کے زیور کی نسبت کہتیں "سنار والے یہ لیجا، تیری محنت کا حق ہے، کل صبح ہی پھر آجانا" میں نے کئی برس تک سنار کے لڑکے کو محل میں آتے اور کام کرتے دیکھا، پھر اس کم کے لونڈے کے پاس کوئی پہرہ بھی نہ تھا، اگر دس بیس نگینے انٹی میں لگا کر لیجاتا ہو تو کیا عجب، مگر کوئی پرسان نہ تھا یہ لال قلعہ کے گئے گذرے وقت کا حال ہے، جب نادر شاہ سب کچھ لوٹ کر لے گیا تھا۔ پھر احمد شاہ نے تاراج کیا تھا۔ پھر بھرت پور والے نے لوٹ مچائی تھی، پھر میاں غلام قادر صاحب نے شاہ عالم کی آنکھیں نکلوا دی تھیں۔

اس پر یہ حال تھا کہ لال قلعہ کی بیگموں اور شہزادیوں کی نظر میں سونا تو سونا ہیرے جواہرات بھی بے حقیقت تھے۔

سبزی منڈی میں ایک شریف زادی امراؤ بیگم ایک چھوٹے سے گھر میں رہتی تھیں۔ بغریب آدمی تھیں۔ سلائی سی کر اپنا اور اپنی لڑکی کا جس کی عمر بارہ برس سے زائد نہ تھی، پیٹ پالتی تھی۔ میاں نوکری کی تلاش میں باہر گئے ہوئے تھے۔ جمعہ کے دن کوئی بارہ بجے لڑکی کو نہلا رہی تھیں، اس کے سر میں جوئیں بہت سی تھیں۔ اس لئے کنگھی میں ڈورا ڈال کر ہونچ رہی تھیں۔ جوئیں لیکھیں دھکیں مارتی جاتی تھیں اور بیٹی کو دور دور رکھتی جاتی تھیں۔ جبھی تو لیکھیں بہہ ہی ہیں۔ اتنے میں

باہر سے آواز آئی "بھجوا دے تیرا بھلا ہوگا۔" امراؤ بیگم نے سمجھ لیا کہ فقیر ہے اور اس کے جواب میں کہا "سائیں برکت ہے۔"

فقیر (دروازہ پر سے) "کہتی ہے کہ برکت ہے، اور آج ہی ساڑھے سات آنے پیسے سلائی میں آئے ہیں۔ اور جوں کے توں تکیہ کے نیچے رکھے ہیں، جھوٹی! فقیروں کو دھوکا دیتی ہے۔"

سچ مچ ہمسائی سلائی کے ساڑھے سات آنے دے گئی تھیں۔ اور امراؤ بیگم نے ابھی سرہانے تکیہ کے نیچے الگ کٹلاک رکھ دئے تھے۔ اب جو فقیر نے باہر سے للکارا عورت ذات۔ امراؤ بیگم تھر تھرا اُٹھیں اور سمجھیں کہ کوئی پہنچا ہوا آ پہنچا۔ ہاتھ سے کنگھی رکھکر ایک آنہ تکیہ کے نیچے سے نکال لائیں اور دروازہ پر جاکر فقیر کو دیدیا۔

فقیر: "جا بچہ مالک تجھے بہت دیگا۔ یہ تو بتا تیرے گھر میں کے آدمی ہیں؟"

امراؤ بیگم: "سائیں میرے میاں تو نوکری کرنے باہر گئے ہیں، اور جب سے گئے ہیں اُنہوں نے خط بھی نہیں بھیجا ہے۔ گھر میں ایک میں ہوں اور ایک بارہ برس کی لڑکی ہے۔"

اِس بات کو سُن کر فقیر نے کچھ سوچا اور اپنی جھولی میں ہاتھ ڈال کر ایک تھیلی سے سوکھی ہوئی کسی درخت کی جڑ نکالی اور اُس کے دو ٹکڑے کئے اور دونوں ٹکڑوں پر جو اُنگلی اُنگلی بھر سے زیادہ نہ تھے کچھ پڑھکر پھونکا۔ اور امراؤ بیگم کو دے کر کہا "مائی آج ہی رات کو ان میں سے ایک حرطی کپڑے میں لپیٹ کر اپنے

بازو پر اور ایک اپنی لڑکی کے بازو پر باندھ دینا۔ اگر دینے چاہا تو تیرے سارے دلدّر دور پار ہو جائیں گے اور سونا چھونا سب کچھ تجھے مل جائے گا۔ تیرا گھر والا بھی ہنسی خوشی بہت سی مایہ لے کر پردیس سے آجائیگا۔"

اس جڑی کے لینے دینے میں فقیر کا تھوڑا بہت امراؤ بیگم سے آمنا سامنا ہو گیا۔ امراؤ بیگم نے دیکھا فقیر منہ پر اور سارے بدن پر بھبوت ملے ہوئے اور موٹا مسٹنڈا ہے، سر پر لمبے لمبے بال ہیں گلے میں ایک جھولی اور ٹانگوں میں ایک لنگوٹی ہے، فقیر چلا گیا۔ اور امراؤ بیگم کے ہاتھ لڑکی کے نہلانے دھلانے سے بھیگے ہوتے تھے، لڑکی بیچاری نہانے کے پٹڑے پر بیٹھی سسک رہی تھی، اس بھول بھول میں امراؤ بیگم نے یہی مناسب سمجھا کہ جڑی کو ایک پاک چیتھڑے میں لپیٹ کر تنبول کے درخت کی ٹہنی پر جو نہلانے دھلانے کے سامان کے پاس ہی تھا باندھ دیا۔ اور لڑکی کو نہلا دھلا کر اور کپڑے پہنا کر شام کا کھانا پکانے میں لگ گئیں اور جڑی کا خیال دل سے اتر گیا۔ عشاء کی نماز کے بعد بچی کو لیکر اور کوٹھری کی کنڈی لگا کر سو رہیں۔ غریب آدمی تھیں۔ ادہی کا تیل چراغ میں جلاتی تھیں۔ چراغ کوئی دس بجے ہی گُل ہو گیا تھا۔ بارہ بجے ایک آواز نے اُسے جگا دیا "جڑی بیچاری کیا کرے تنبولوں باندھی"۔ یہ آواز ٹھیر ٹھیر کر آتی تھی اور قریب یہ کہتا تھا کہ رات کے سناٹے میں دُور تک جاتی تھی۔ "جڑی بیچاری کیا کرے تنبولوں باندھی۔ جڑی بیچاری کیا کرے تنبولوں باندھی"۔ یہ آواز آدمی کی آواز سے ملتی جلتی نہ تھی بلکہ یہ آواز تیمر کی

یا زمین کی یا کسی لکڑی کی غیر معمولی آواز تھی، جیسا کہ کٹی ڈراونی تھی، اس آواز کو سُن سُن کر امراؤ بیگم اور اُن کی لڑکی کا کلیجہ بیٹھا جاتا تھا۔ وہ پلنگ پر بیٹھے بیٹھے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ آواز رہ رہ کر آتی تھی، کہ ایک گھنٹہ بعد امراؤ بیگم سمجھیں کہ یہ آواز اس جڑی کی ہے جو تنبول کے پیڑ میں باندھ کر بھول گئی اور اپنے اور اپنی بچی کے بازو پر نہ باندھی۔ یہ جڑی جادو کی ہے، اور میں باندھ لیتی تو خدا جانے مجھ پر اس کا کیا اثر ہوتا۔ روتی جاتی تھی اور دُعا کرتی جاتی تھی کہ الٰہی اس کا وارث بھی گھر پر نہیں، کوئی بھائی بند بھی یہاں نہیں ہے۔ دیکھئے کیا بنتی ہے، پو پھٹی، اور وہ آواز آنی بند ہو گئی۔ امراؤ بیگم دل کڑا کر کے اُٹھیں کوٹھری میں سے باہر آئیں۔ وضو کیا، صبح کی نماز پڑھی۔ ابھی یہ جانماز پر سے اُٹھی بھی نہ تھیں کہ اُس کے دروازے پر کئی محلے والے آئے اور کُنڈی کھٹکھٹائی۔ یہ دروازہ پر گئیں تو محلے والوں نے کہا۔ "بی امراؤ بیگم! آدھی رات سے تمہارے گھر کے اندر سے صبح تک یہ آواز آتی رہی ہے" جڑی بیچاری کیا کرے تنبولوں باندھی" یہ کیا بات ہے؟"

امراؤ بیگم نے کل کا سارا قصہ بیان کیا اور کہا "میں کوٹھری میں چلی جاتی ہوں تم گھر میں آ کر وہ جڑی دیکھ لو۔"

پردہ ہو گیا پڑوسی گھر میں آئے اور جڑی تنبول کے پیڑ میں بندھی دیکھی اور ان لوگوں سے ایک بڑے میاں نے کہا "میں اس جوگی کو پچاس برس سے

جانتی ہوں، یہ کھوری بھٹیاری کے محل کے پاس رہتا ہے، بڑا جادوگر ہے، امراؤ بیگم اپنے بالڑکی کے بازو پر یہ جڑی باندھ لیتیں تو باؤلی ہو کر جوگی کے پاس جاتیں"۔

دو چار دبنگ آدمیوں نے بڑے میاں سے پتہ لیا اور کھوری بھٹیاری کے محل پر پہنچے اور جوگی کی خوب دُھن کٹی کی۔

شاہجہاں آباد میں نقشبندی بزرگوں کے دو گھر تھے، ایک خانقاہ میرزا جان جاناںؒ اور دوسری بارہ دری حضرت خواجہ میر دردؔ صاحب کی، جن کے نواسے کی میں مُرید تھی، ان بزرگوں کی وجہ سے توران کا توران شاہجہاں آباد میں اُمنڈ آیا تھا، سینکڑوں مغل ان حضرات کے مُرید شہر کے اندر رہتے تھے اور سبزی منڈی میں تو مغل پورہ کا ایک محلہ ہی ان کے نام سے بس گیا تھا، یہ لوگ بڑے بہادر تلوار یئے اور سپاہی تھے، بادشاہی فوج میں بھرتی ہو کر دکن گئے تھے اور وہاں اپنی سُورماپن دکھا رہے تھے۔ شیریں بیگ اور شکر بیگ جب گھوڑے کُداتے لاہوری دروازہ سے چاندنی چوک میں آتے، دلی والوں سے چھیڑ چھاڑ ہو جاتی تلوار کے دو دو ہاتھ ہوتے بغیر نہ رہتے۔ دلی والے بھی رستم و اسفندیار تھے، تلوار کا جواب تلوار سے اور خنجر کا جواب خنجر سے دیتے تھے۔ دونوں طرف کے بہادر گھائل بھی ہو جاتے تھے۔ چوٹیں کھانے پر بھی کوئی تھانہ کوتوالی نہ جاتا تھا۔

ایک روز جو میں اپنے پیر و مرشد کی زیارت کو بارہ دری آئی تو میں نے دیکھا

حضرت کے محل میں مغل پورہ کی کوئی پچاس مغلانیاں اور ان کے بچے ٹھہرے ہوئے ہیں، میں نے مولوی ناصر جان کی بیوی امامی بیگم صاحبہ سے جو خواجہ میر درد صاحب کی پوتی تھیں پوچھا کہ "حضرت آپ کے ہاں آج نہ تو کوئی عرس ہے اور شادی بیاہ بھی جم ہی جم ہے۔ پھر یہ مغل پورہ والیاں کیوں آئی ہیں؟"

بیگم صاحبہ نے جواب دیا "مصیبت زدہ ہیں، ڈر کے مارے گھر بار چھوڑ کر چلی آئی ہیں۔ خانم تم جانتی ہو ان کے مرد مغل پچاس کی عمر سے لیکر بارہ برس کے بچے تک بادشاہ کے ساتھ دکن کی چڑھائی پر گئے ہوئے ہیں، گھروں میں یہ سب عورتیں ہی عورتیں ہیں یا چھوٹے چھوٹے لڑکے لڑکیاں، کوئی آٹھ دن ہوئے کہ ان کے ہاں دروازہ پر ایک فقیر آیا جس کی صدا تھی "مائی چھنن منن کی پھیریاں، مائی چھنن منن کی پھیریاں"۔ ان میں سے ایک مغلانی نے اپنی ماما سے کہا "فقیر کھڑا ہے اسے آٹے کی چٹکی دے آؤ"۔ ماما سے آٹا لے کر دروازہ پر گئی، فقیر سے کہہ آئی "بابا یہ بیس گھر والی مغلوں کے ہیں، سب کے سب مرد اپنی نوکری بجانے دکن گئے ہوئے ہیں۔ گھر میں مرد کے نام چڑیا کا بچہ بھی نہیں ہے نری عورتیں ہی عورتیں گھروں میں رہتی ہیں مگر بابا یہ گھر ہے مالداروں اور غاروں جیسا بھرا پڑا ہے"۔ فقیر نے ماما کی یہ باتیں غور سے سنیں اور کہتا چلا گیا "مائی چھنن منن کی پھیریاں، مائی چھنن منن کی پھیریاں"۔ ماما پلٹ کر گھر میں آئی تو گھر والیوں نے کہا "تو کہاں مر گئی تھی اور فقیر سے کیا کہہ رہی تھی"۔ ماما نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں فقیر سے یہ باتیں

کہہ آئی ہوں۔ ماما کی گفتگو سُن کر کہا "نمک حرام تیرا ستیاناس جائے گھر کا بھید دے آئی اور یہ جتا آئی کہ گھر میں مردوں کے نام چڑیا کا بچّہ نہیں ہے۔ دیکھنا فقیر رات کو ڈاکہ لے کر آئیگا، ہمارے گھروں کو لوٹ کر لے جائے گا، اور عزّت پر بھی بن جائے گی۔"

ان کے گھروں میں کھڑکیاں ہیں، ضرورت کے وقت ایک گھر میں سب عورتیں اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ "مغلانیوں نے مل جُل کر ایک بات ٹھہرائی اور رات کو جب کھانا پکا کر کھا چکیں تو مردانہ بھیس بدل، ڈھاٹے باندھ اپنے اپنے مردوں کے ہتھیار لے اپنے مکانوں کی چھتوں پر چڑھ گئیں اور مشعلیں جلا جلا کر کھڑی ہو گئیں۔" ساری رات چھتوں پر ٹہل کر کاٹ دی، دوسرے دن پھر وہی فقیر "مائی چھنن منن کی پھیریاں، مائی چھنن منن کی پھیریاں" کہتا ہوا آیا اور ماما اُس کی صدا سُن کر دوڑی۔

فقیر: "جھوٹی مُردار، تُو تو کہتی تھی کہ ان گھروں میں مرد نہیں ہیں۔ رات کو ان کے گھروں کی چھتوں پر مرد ہی مرد تلواریں بندوقیں ہاتھوں میں لئے پہرہ دیے رہے تھے مشعلیں روشن تھیں، ہم خود آکر دیکھ گئے تھے۔"

ماما:- بابا میں جھوٹ نہیں بولا کرتی ہوں، میں نے تم سے سچ بات کہی تھی، سچ مچ گھروں میں کوئی مرد نہیں ہے مگر ان عورتوں سے خدا بچائے، یہ بڑی لڑاکا ہیں۔ سماں کو پھاڑتی ہیں اور کھنگلی لگاتی ہیں، رات کو اپنے مردوں کے کپڑے پہن مردوں

کے ہتھیار سنبھال چھتوں پر چڑھ کھڑی ہوئیں۔"

یہ باتیں بنا نیوں گھر میں آئی تو مغلانی نے پوچھا "کہو آج شاہ جی سے کیا کہہ سن آئیں؟" ماما نے جو کچھ کہا تھا اُسے دُہرایا۔ سب مغلانیاں رونے پیٹنے لگیں اور اُنہوں نے کہا "گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ آج ڈاکے والوں پر بھید کھُل گیا، رات کو وہ ضرور آئیں گے۔ اور ہم بے وارثی عورتوں کو لوٹ کر لے جائیں گے مصلحت یہی ہے کہ شام سے پہلے پہلے اپنے اپنے مال و متاع لے کر حضرت صاحب کے دروازہ پہ بارہ دری میں چل پڑو اور اس کٹنی حرام خور کو گھر ہی میں چھوڑ دو، اور اُسی دن اپنا گہنا پاتا اور نقدی لے کر بارہ دری میں آ گئیں۔

کل ایک آدمی مغل پورے سے آیا تھا۔ وہ کہہ گیا ہے کہ "جس دن آپ یہاں آ گئی ہیں، اُسی رات کو مغل پورے میں ڈاکہ پڑا اور بہت سے گھر لُٹ گئے، آپ کے گھر میں بھی ڈاکو جا گھُسے تھے۔ مگر کچھ سامان اُنہیں پسند نہ آیا، اس لئے خالی ہاتھ گئے۔ البتہ آپکی ماما کو مار کر گچلا کر گئے اور اُس سے کہہ گئے تو نے ہمیں ناحق پریشان کیا۔" ماما کے پٹنے پر مغلانیاں بہت ہنسیں۔ اب حضرت بابا نے کوتوالی کو خط لکھدیا ہے اور اُس نے مغل پورہ کی حفاظت کا بندوبست کر دیا ہے، دو چار دن میں مغلانیاں اپنے اپنے گھروں کو سدھار گئیں۔"

---

۱۳ اکبر ثانی کا انتقال رات کے دو بجے ہوا۔ خبردار دم بدم کی خبر ولیعہد کو دیتے

رہے تھے اور ولیعہد تاج اور لباس اور جواہر اور زیور کا خوان لئے بیٹھے تھے، اور اس انتظار میں تھے کہ ہیں کب یہ سنوں کہ کسی کا کپّا لڈھ گیا اور تخت بادشاہی پر بیٹھ جاؤں۔ چنانچہ ایک خبردار نے خبر دی کہ حضور مبارک ہو، مسافر گیا۔ بس فوراً میرزا ابن ولیعہد بہادر نے شاہانہ لباس پہنا اور چاہا کہ تخت پر قدم رکھیں، جو نجومی اور جوتشیوں نے کہا وقت اچھا نہیں ہے، سورج نکلے جلوس فرمائیگا۔ اندھیرے میں تخت پر بیٹھنا نحس ہے، ولیعہد نے کہا میرے لئے نحس ہے یا رعایا کے لئے نجومی کہنا تو چاہتے تھے کہ دونوں کیلئے بُرا ہے مگر ولیعہد کے ڈر سے کہہ دیا کہ حضور رعیت کے لئے اچھا نہیں ہے، ولیعہد نے کہا۔ خیر دیکھا جائے گا آفتاب نہ ہوگا تو کیا روشنی نہ ہوگی اور مشعل اور مہتاب اور شمع و چراغ ایسی جگ مگ ہوئی کہ دن نے مات کھائی، ولیعہد تخت پر بیٹھے۔ ابوظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ لقب اختیار کیا، ان کے تخت پر بیٹھتے ہی کال پڑا۔ سارا ہندوستان تراہ تراہ پکارنے لگا۔ آدمیوں نے بھوک کے مارے اپنے بچے بھون کر کھا لئے۔ آگرہ کی طرف سے گیہوں ناؤ میں بھرا ہوا کئی ہزار من آرہا تھا۔ جب ناویں لال قلعہ کے پاس کنارے پر لگیں اس سے پہلے کہ اناج کی بوریاں کھاری باولی میں پہونچائی جائیں کنگلوں اور بھوکوں نے لوٹ لیں اور اناج کا دانہ دانہ لے گئے، دلّی کی عورتوں میں آنکی بھی یادداشت بن گئی تھی۔ ایک سے دوسری کہتی تھی کہ جب ناویں لٹی تھیں تو میں بارہ برس کی تھی، ناویں لٹی تھیں تو یہ بات یوں ہوئی تھی، بہادر شاہ کی بیوقت تخت نشینی

کے متعلق ایک نظم پڑھتی تھیں جو بہت بڑی تھی مگر میں نے اُسے یاد نہیں کیا نہ یاد کرنے کی ضرورت تھی نہ اُس کا کوئی موقع تھا۔ دو چار مصرعے حافظہ میں جم گئے تھے وہ ناظرین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں سے تخت پہ بیٹھنا ان کا نہ سزاوار ہوا۔ مہنگا ایکبار ہوا۔ مصرعہ۔ شاہ اکبر کا دماغ اور تھا انکا ہے کچھ اور۔ کی سلاطین کی غور کا ٹنے لوگوں کے سر کرکے اندھیر افسوس۔

اور سچ یہ ہے کہ ان کی بے وقت تخت نشینی اپنا رنگ لائی اور شاہجہاں آباد کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ سلطنت اُجڑ گئی، لال قلعہ کا ڈھانچہ رہ گیا، نام ونمود کا پانی ملتان بہ گیا۔

---

۱۲ پانچ پانچ چھ چھ برس کی دو لڑکیاں آمنے سامنے بیٹھ جاتیں، ایک دوسرے کی ہاتھ کی انگلیاں انگلیوں میں ڈال لیتیں اور آہستہ آہستہ ہلتی جاتیں اور کہتی جاتیں "ماما کوئی ایسا سنخی کوئی ویسا سنخی کوئی چڑیا کا بچہ چھڑا دینا" جب اس کھیل کو دکو دیر ہو جاتی تو کوئی لڑکا لڑکی۔ کوئی بیگم اٹھتیں، لڑکیوں کی انگلیوں سے انگلیاں نکال دیتیں، وہ دونوں لڑکیاں اپنے گمان میں چڑیاں تھیں اور لڑنے کے لئے گویا گتھ گئی تھیں تیسرے شخص نے آکر بیچ بچاؤ کرایا۔

---

۱۳ برسات کے موسم میں جب بیر بہوٹیاں نکل پڑتیں تو بادشاہ زادیوں کو اُن کا

لال مخملی پن بہت پسند آتا، ایک ایک بیر بہوٹی ایک ایک اشرفی کو مول لیجاتی اور
بچّوں کو بانٹی جاتیں۔ ایک بادشاہزادی جس کی عمر پانچ برس کی ہوتی، بیر بہوٹی
کو اپنی ہتھیلی پر رکھ لیتی، وہ ہاتھ کے ہلنے جلنے سے اپنے پنجے سمیٹ لیتی، اور گول
مُول ہوکر مُردہ بنجاتی تو بادشاہزادی کہتی، بیر بہوٹی پنجہ کھول تیرا ماموں آیا بیر بہوٹی
پنجہ کھول تیرا ماموں آیا۔ آخر ہتیلی کی حرکت تھم جاتی تو بیر بہوٹی پھر اپنی انگلیاں
کھولتی اور چلنے لگتی۔ اس پر وہ خوشی مناتی جاتی کہ اللہ اللہ، شام کے وقت
سونے کی ڈبیہ میں بیر بہوٹی بند کیجاتی، داروغہ کے سپرد ہوتی۔ اگر کہیں رات
کو بیر بہوٹی مر کر رہ گئی تو صبح اُٹھ کر چھوٹی بیگم روتے روتے اپنی آنکھیں سوجا لیتیں۔
بڑی بیگم اپنی بچّی کو چمکارتی اور فرماتیں قربان کی تھی اپنی لاڈو پر سے موئی دو کوڑی
کی بیر بہوٹی۔ اری ساز گار ردانہ ذرا ڈیوڑھی پر جانا، دس اشرفیاں ردّنہ کو دے
آنا اور سمجھا آنا کہ بیوی بنّوں کے لئے موٹی موٹی نرم نرم بیر بہوٹیاں لا دے۔ ردّنہ
اشرفیاں لے کر جاتا اور گھنٹہ دو گھنٹہ میں پلٹ کر آتا اور ڈیوڑھی میں کھڑا ہوتا
اور چیخ کر کہتا حضور بیر بہوٹیاں آگئی ہیں، مگر آج منڈی میں بیر بہوٹیوں کا بھاؤ
دوگنا تھا۔ دس اشرفیاں قرض لے کر آیا ہوں، بڑی بیگم فرماتیں، ردّنہ بڑا
نمک حلال ہے، اس نے اشرفیوں کا مُنہ نہ کیا اور ہمارا حکم بجا لایا، دس اشرفیاں
اُسے اور دو تاکہ بیر بہوٹی والے کا قرض چکا دے اور انعام کے گیارہ روپے الگ
اُسے دیدے جائیں۔

۱۳ لال قلعہ کی ایک بیگم طوطے کو سبق پڑھا رہی تھیں "حق اللہ پاک ذات اللہ صحیح تو خدا۔ خدا کا رسول، تو غافل نہ ہو، خدا کو نہ بھول، جگ جگ جیا کرو، دودھ بتاشے پیا کرو، نام نبی کا لیا کرو، اٹھ فقیر چل مکہ کو، اٹھ فقیر چل مکہ کو سے

ان فی الجنۃ قصر لبن   لعلی ولدہ الحسین وحسن

پڑھو میاں مٹھو پڑھو۔ بیوی کا مٹھو" اگر اس سبق کو سن کر طوطے نے ٹیں ٹیں کی تو خیر نہیں، بیگم نے خفا ہو کر فرمایا "پڑھو تو پڑھو نہیں تو پنجرہ خالی کرو۔"

---

۱۴ فرنگیوں نے جب کلکتہ سے شاہجہاں آباد کو ریل لانی چاہی تو بادشاہ سے درخواست کی کہ اس کے ٹھیرنے اور اس میں چڑھنے اترنے کے لئے شہر میں اسٹیشن بنانے کے لئے اجازت ہو۔ اگرچہ فرنگی سارے ملک اور سارے شاہجہاں آباد پر قابض ہو چکے تھے مگر نام کے بادشاہ کا ادب کرتے تھے اور اسی سبب سے اور اسی لئے منہ چھوانے کے لئے یہ بات کہی تھی، جہاں پناہ نے فرمایا "ہاں ہیں چیل گاڑی کا چرچا بہت دن سے سن رہا ہوں، توبہ توبہ وہ شہر میں چلے گی تو اس کی گڑگڑاہٹ سے پیٹ والیوں کے پیٹ گر جایا کریں گے۔ آدمی پس پس جائیں گے، اس کے دھوئیں سے آنکھیں بیمار ہونگی، تمہیں اگر چیل گاڑی لانی ہو تو اس کا اسٹیشن کشمیری دروازہ سے چھ سات میل پرے بناؤ۔" اور فرنگیوں نے بادشاہ سلامت کے اس حکم کو مان لیا اسٹیشن کیلئے شہر سے بہت پرے جگہ کی تجویز ہو گئی تھی مگر خدا کو کچھ اور منظور تھا۔

لال قلعہ کی بیگموں کا اعتقاد تھا کہ ٹیٹری جو پرندہ ہے اور اکثر تالابوں کے کنارے رہتا ہے اس کے حلق میں چھید ہے، جب یہ پانی پیتا ہے تو باہر نکل جاتا ہے اور یہ غریب چڑیا پیاسی رہ جاتی ہے اور ساری عمر یہ کہے جاتی ہے ٹیٹری ہوں پیاسی ہوں ٹیٹری ہوں پیاسی ہوں، ایک بوند بھی اُس کے حلق سے نیچے نہیں اُترتی ہے اور یہ پیاسی ہی مر جاتی ہے۔

دوسرے کوئل جو کو کو پکارتی ہے یہ آموں پر عاشق ہے۔ جب آموں کے درختوں پر مور آتا ہے اور کیریاں لگتی ہیں یہ آم کھانے کی آرزو میں چیخ چیخ کر گیت گاتی ہے مگر جس وقت آم تیاری کے قریب آتا ہے تو اس کی باچھیں پک جاتی ہیں، یہ آم کھانے سے محروم رہتی ہے اور اسی حسرت میں اُس کی عمر کٹ جاتی ہے۔

ایک دن جہاں پناہ خاصہ نوش فرما رہے تھے اور چلمن کے پیچھے میں اور میری ساس حاضر تھیں، ملکہ زینت محل نے کہا "حضور یہ جو کرگ باران دیدہ کہلاتا ہے تو کیا بھیڑیئے کے بارہ آنکھیں ہوتی ہیں"؟ اس بات کو سُن کر بادشاہ سلامت بہت ہنسے اور فرمایا "نہیں نہیں یہ بات غلط ہے بلکہ بڑوں سے ایسا سُنا ہے کہ جب برسات بہت برستی ہے اور جل تھل بھر جاتے ہیں جنگل اور میدانوں میں پانی ہی پانی ہوتا ہے تو گیدڑ، لومڑیاں بھیڑیئے اپنے اپنے بھٹوں

ہیں اور اپنے اپنے گھروں میں چھپے رہتے ہیں، ایسا بھی موقع ہوتا ہے کہ ایک کھو
میں دس پندرہ بھیڑیئے گھس کر بیٹھ جاتے ہیں اور مینھ اور پانی کی مار سے باہر
نہیں نکل سکتے، بھوک کے مارے بولاتے ہیں۔ اُن میں سے جو نڈھال ہوجاتا ہے
اور ناتوانی سے آنکھیں بند کرلیتا ہے تو اور بھیڑیئے اُسے تکہ بوٹی کرکے کھالیتے
ہیں اور اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں، اسی طرح ہر روز ایک آدھ بھیڑیا ادھ موا ہوتا
رہتا ہے اور اور بھیڑیئے اُسے کھاتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ اُن میں سے بچ
بچا کر ایک بھیڑیا رہ جاتا ہے اور اب مینھ بھی کھل جاتا ہے، جھڑ موقوف ہوجاتا
ہے تو یہ بھیڑیا کھو سے نکلتا ہے، مگر بڑا چوکنا اور بہت ہی چالاک ہوجاتا ہے،
اپنے سائے سے بھڑکتا ہے، پتّہ سے بھڑکتا ہے اور جب کوئی آدمی ایسی ہی
ہوشیاری کی لیتا ہے تو کہتے ہیں وہ گرگ باراں دیدہ ہے، اسی طرح جب
کوئی بھیڑیا اور اُس کی مادہ اور پانچ بچے اُن کے ساتھ جنگل میں پھرتے ہیں۔
اور شکار ڈھونڈتے ہیں تو ستا مار دہن کہلاتے ہیں، یہ سب کے سب داؤ کرتے
ہیں اور جا بجا چھپ جاتے ہیں اور ہرن بیچارے کو پکڑ لیتے ہیں اور مل جل کر
چبا جاتے ہیں۔ کوئی آدمی بے بلائے اپنے جورو بچوں کو لے کر کسی کے ہاں مہمان
آجاتا ہے تو طعن سے کہا جاتا ہے لو لو استا مار دہن آ پہونچی۔"

جہاں پناہ کے چڑیا خانہ میں ایک بُلبل ہزار داستاں پلی ہوئی تھی سونے
کے تار کے پنجرے میں رہتی تھی، اُستاد میرن جو چڑیا خانہ اور کبوتر خانہ کے

داروغہ تھے اُس کی رکھیا کرتے تھے۔ اُس کے پنجرے پر کئی کئی بستنیاں منڈھی رہتی تھیں، جب بہار کا موسم آجاتا تو بُلبُل کو چہکنے کا شوق ہوتا۔ اُستاد میرن اُس کا پنجرہ لے کر بیگم کے باغ میں آتے تھے اور رکھنے کی درخت کی ٹہنی میں اُسے لٹکا دیتے؛ شہر میں ایک روز پہلے سے دھوم مچ جاتی تھی کہ کل مغرب کے وقت اُستاد میرن بادشاہی بُلبُل کا پنجرہ لے کر بیگم کے باغ میں آئیں گے، شوقین لوگ اپنی اپنی اگن، چنڈول، طوطے، مینا، دیڑ، شاما وغیرہ بولنے والوں جانوروں کے پنجرے لے کر بیگم کے باغ میں پہنچتے، گھاس کے تختوں پر جو مخمل کو مات کرتی تھی پھسکڑا مار کر بیٹھ جاتے اور اپنے اپنے پرندوں کے پنجرے اپنے آگے رکھ لیتے۔ بادشاہی بُلبُل ہزار بولیاں بولتی جنہیں سُن کر سُننے والے سبحان اللہ کہتے، بُلبُل کے دم کو سُن کر کوئی پرندہ شوقین کا چہکنے لگتا تو اُس کا مالک پنجرے کو تھپک دیتا جس سے یہ مراد تھی کہ بُلبُل ہزار داستاں کی بولی کان لگا کر سُن اور چُپ رہ تاکہ تجھے بھی یہ بانک آجائے اور فی الواقع بُلبُل کی بولیاں سُن سُن کر شاہجہاں آباد کے شوقین لوگوں کے اگن، چنڈول خوب بولنے لگتے تھے اور شوقین لوگ فخریہ کہتے تھے، کہ جناب ہمارے اگن، چنڈول نے بادشاہی ہزار داستاں کی مار کھائی ہے کبھی کبھی بلبل کا پنجرہ رات کے وقت محل میں بھی آجاتا تھا اور جہاں پناہ کے چھپرکھٹ کے پاس لٹکا دیا جاتا تھا۔ جب تک حضور کا جی چاہتا اُس کا چہکنا

سُنتے تھے، جب جی چاہتا پنجرہ باہر بھجوا دیا جاتا۔

سب بادشاہزادوں کو گانے بجانے کا بڑا شوق تھا، اچھے اچھے گویّے اور کلاونت نوکر رکھ کر اس بات کو اُن سے سیکھتے تھے، کوئی قسم گانے کی ایسی نہ تھی جسے یہ لوگ ادا نہ کرتے ہوں، کوئی ساز ایسا نہ تھا جو یہ لوگ سلیقہ سے نہ بجاتے ہوں، اچھے اچھے استاد اس کام میں اُن کے آگے کان پکڑتے تھے، مگر سارنگی اُن میں سے ایک کو نہ آتی، کہتے تھے اماں یہ ٹیڑھی کھیر ہے، نہ اس میں کوئی پردہ ہے نہ سُندری ہے، رستہ کیونکر چلا جائے، یہ پیشہ وروں ہی کا حصّہ ہے، ان کی ہڈی بولتی ہے، مرزا گوہر صاحب، مرزا کالے صاحب، مرزا چڑیا صاحب ستار بجانے میں اُستاد ہو گئے تھے۔

چوسر، پچیسی، گنجفہ، تو بادشاہزادوں کے آگے کچھ حقیقت ہی نہ رکھتا تھا، شطرنج بہت اچھی کھیلتے تھے، یہاں تک کہ غائب کھیلتے تھے اور فرنگیوں سے کھیلتے تھے اور اُنہیں مات دیتے تھے اور جیتتے تھے۔

بادشاہزادوں اور اُن کے باپ دادوں کو تین شوق ضرور ہوتے تھے، ایک نجوم کا، ایک مصوری کا، ایک خوشنویسی کا، اور ان سب میں کمال پیدا کرتے تھے،

بابر بادشاہ اور ان کے بیٹوں کے ہاتھ کے مرقعے میں نے ایسے عمدہ دیکھے ہیں
جن کے آگے مانی اور بہزاد کی کاریگری ہیچ ہے اور دارا شکوہ اور عالمگیر
اورنگ زیب اور ان کے بھائیوں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی وصلیاں اور قطعے
بادشاہ سلامت کے پاس بہت سے تھے انہیں دیکھ کر مشق کیا کرتے تھے اور
فرمایا کرتے تھے کہ وصلیاں ہمیں تبرک ہیں۔

ہمارے جہاں پناہ عربی اور فارسی خط کے کامل تھے، میں ٹھیک نہیں کہہ
سکتی کہ شاید خوشنویسی کے استاد حضور کے میر کلو صاحب تھے اور بادشاہ
نے بھی اس ہنر میں سینکڑوں کو شاگرد کیا تھا۔

حافظ امیر الدین صاحب بادشاہ کے ہی شاگرد ہیں جنہوں نے ایسا قرآن شریف
لکھا جس کی دھوم لندن اور روم تک ہو رہی ہے، منشی ممتاز علی صاحب جو قرآن
چھپاتے پھرتے ہیں لکھنے میں ہمارے جہاں پناہ ہی کے شاگرد ہیں اور بادشاہ
نے خطاب عطا کیا، بادشاہ تک ایسے بڑے بڑے راجہ نوابوں کی پہنچ نہ ہو سکتی
تھی، مگر حکم تھا کہ جو ہنرمند ہو یا شاگرد ہونے آئے اسے آنے دو اور اسی
بہانے بہت سے لوگ کبھی حضور تک جا پہنچتے تھے۔

حضور کو حضرت میاں کالے صاحب سے بیعت تھی اور ایسا اعتقاد تھا کہ
میں بیان نہیں کر سکتی بس پیر پرستی کرتے تھے، قاسم جان کی گلی میں جو حضرت کا

حویلی نذر کی تھی وہ لاکھوں روپے کی تیاری کی تھی جس میں باغ تھا، نہر تھی، سینکڑوں مکان شاہانہ اس میں تھے، حضرت میاں کالے صاحب بھی لال قلعہ میں جایا کرتے تھے، اور بادشاہ سلامت بھی حضرت کے دولت خانہ پر حاضر ہوا کرتے تھے۔ ایک دفعہ بادشاہ سلامت کچھ حضرت سے رنجیدہ ہوگئے، حضرت کو تو کیا غرض پڑی تھی جو لال قلعہ میں جاتے، مگر بادشاہ سلامت بھی اپنی بادشاہت کے گھمنڈ میں حضرت کے سلام کے لئے حضرت کی حویلی میں کئی دن تک حاضر نہ ہوسکے، آخر بادشاہ سلامت کو خدا نے سمجھ دی۔ اور وہ یہ سمجھے کہ مجھ سے غلطی ہوئی جو میں پیرو مرشد کی خدمت میں حاضر نہ ہوا مگر اب چلنا چاہیئے، خود بدولت ہاتھی پر سوار ہوئے، حکیم احسن اللہ خاں صاحب وزیر کو ساتھ لیا۔ جب حضرت کے دروازے پر پہنچے تو ہاتھی پر سے اترے، حکیم صاحب سے کہا کہ رومال سے میرے ہاتھ باندھ دیجئے، اتنے میں حضرت کے صاحبزادے میاں غلام نظام الدین صاحب آگئے، اُن کی عمر اُس وقت پانچ چھ برس سے زیادہ نہ تھی، بادشاہ سلامت کو دیکھ کر بھولے منہ سے فرمانے لگے "ہمارے ابا جان کے پاس اُلٹے بالوں والے (یعنی سِکھ) آئے تھے، نری اشرفیاں دے گئے ہیں، کوٹھری میں ڈھیر لگ رہا ہے" بادشاہ سلامت اس بات کو سن کر سُن ہوگئے، اطلاع کرائی کہ بہادر شاہ حاضر ہے حکم ہو تو روبرو حاضر ہو، جواب ملا شوق سے تشریف لائیں، جب بادشاہ میاں صاحب کے سامنے رومال سے ہاتھ بندھے پہونچے تو کہا:۔

بردرآمد بستہ بگریختہ   آبروئے خود و بعد میاں ریختہ

اور دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ میاں کالے صاحب نے اٹھ کر بادشاہ سلامت کے ہاتھ کھول دیئے اور گلے سے لگا لیا۔

بادشاہ سلامت: "حضور اپنے بڑوں کا صدقہ اس غلام کی خطا معاف کیجئے۔"

میاں کالے صاحب: "میں نے تمہاری خطا معاف کی اور میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ میرے اور تمہارے گناہوں کو بخشدے۔ ابوظفر تم نے جو خیال کیا تھا کہ غلام نصیر الدین (کالے صاحب کا نام ہے) کے بال بچے لال قلعہ سے پلتے ہیں، یہ تمہارے دماغ کا قصور تھا۔ تمہیں یہ بھید نہیں معلوم کہ جب میں نے تو لنشریفیا حاضر ہو کر شاہ سلیمان صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی تو حضرت نے فرمایا دیکھو تم بات ضرورت سے زیادہ نہ کرنا، میں نے عرض کی بہت خوب، اُس دن سے میں برائے نام بولتا ہوں، نہیں اشاروں سے ہی کام لیتا ہوں۔ پھر ارشاد کیا کہ آنکھیں بند کرو، میں نے اپنی آنکھیں بند کیں تو دیکھا کہ میں ایسی زمین پر ہوں جو سونے کی بنی ہوئی ہے اور شاہ سلیمان صاحب کے ہاتھ میں چاندی کا کھرپا ہے۔ وہ کھرپا آپ نے میرے ہاتھ میں دے کر فرمایا سونے کی جس قدر ضرورت ہو اس زمین میں سے کھود لینا اور خرچ کرنا مگر کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا، وہ دن ہے اور آج کا دن ہے اُس زمین سے سونا کھودتا ہوں اور کچھ سے اٹھاتا ہوں اس اٹھوارے میں جو تم نہیں آئے، کسی نے مجھے چاندی کا روپیہ نہیں دیا بلکہ

جس نے دس اشرفی سونے کی دی، ایک فوج سکھوں کی آئی اور ڈھیر ساری اشرفیاں دے گئی؟" یہ فرما کر میاں نے نوکر سے اشارہ کیا اُس نے کوٹھری کا دروازہ چوپٹ کھول دیا اور بادشاہ سلامت نے دیکھا کہ کوٹھری اشرفیوں سے پڑی جگمگا رہی ہے۔ بادشاہ سلامت نے یہ تماشا دیکھکر اپنے جی میں کہا چھوٹے میاں نے ڈیوڑھی پر فرما دیا تھا۔ بادشاہ کی وجہ سے میاں کا سارا شہر ادب کرتا تھا۔ جب میاں غلام نظام الدین کا بیاہ ہونے لگا تو مرزا نوشا نے ایسا سہرا لکھا جو ولیعہد کے سہرے سے اچھا تھا مگر میں بھول گئی، دو ایک شعر یاد رہ گئے وہ سُنا تی دیتی ہوں

چرخ تک دھوم ہے کس دھوم سے آیا سہرا
چاند کا دائرہ لے زہرا نے گایا سہرا

رشتے لڑی میں پیمبر الجھ کر لڑیاں
باندھنے کے لئے ...... اٹھایا سہرا

میاں کالے صاحب اور بادشاہ سلامت کے آپس کے حالات اتنے بہت سے ہیں اگر انہیں لکھے جاؤں تو کتاب بن جائے۔ جب میاں کالے صاحب کا انتقال ہوا تو سارے شاہجہاں آباد میں تہلکہ تھا۔ مومن خاں نے فوراً آپ کی تاریخ وفات کہی جو شہر کے بچے بچے کی زبان پر پہنچ گئی اور وہ یہ ہے۔

ہوئی جس دم وفات حضرت کی
مجھ کو تاریخ کا خیال آیا

ہاتف غیب نے کہا ناگاہ
کالے صاحب کو نُہِ خرد پایا
۶۸

غدر میں جب میاں کالے صاحب کی حویلی لٹی ہے تو لوٹنے والوں نے چودہ

چھکڑے سونے چاندی کے پایتے پٹیوں والے پلنگوں سے بھرے تھے۔

لال قلعہ کی تمیز اور بات چیت میں شاہجہان آباد کی تمیز اور بات چیت میں بڑا فرق تھا۔ ایک بیاہ کی محفل میں لال قلعہ کی بیگمیں شاہجہان آباد کے اندر شریک ہوئیں، محل کی انگنائی میں ایک چوکہ پر شاہجہان آباد کی لڑکیاں جن کی عمر پانچ چھ سال سے زیادہ نہ تھی دس پانچ بیٹھی آپس میں کھیل رہی تھیں، ان ہی میں ایک قلعہ کی رہنے والی بادشاہزادی بھی بیٹھی تھیں جن کی عمر بھی شہر والی لڑکیوں سے زیادہ نہ تھی۔ شہر والی لڑکیاں تو کہہ کر ایک دوسرے سے بولتی تھیں اور قلعہ والی لڑکی کو تو نہیں بھاتا تھا، وہ اُن کی باتوں سے گھبرا گئی تو توتلی بولی میں کہنے لگی۔ بیگم "تو" نہیں کہتے ہیں "تم" کہتے ہیں مگر نقارخانہ میں طوطی کی صدا کون سنتا ہے۔ اُن کے کہنے کا کسی نے خیال بھی نہ کیا تو اُنہوں نے ددا سے کہا۔ "ددا تم مجھے گود میں اٹھا کر لے چلو، یہ تو تکار مجھ سے نہیں سُنی جاتی۔"

بچوں کی زبان میں طاقت آنے کے لئے یہ کہاوت اُنہیں سکھاتیں "لپ بھر سٹا، مُٹھی چنے، ٹکڑا روٹی، گڑ کی ڈلی" اور بچوں سے کہا جاتا لپ کہو تو ایک ہاتھ سے لپ بناؤ پھر "مُٹھی چنے" کہو تو مٹھی بناؤ، ٹکڑا روٹی کہو تو ہتھیلی میں دو انگلیوں کو گول کر اور انگوٹھا اس پر رکھ کر ٹکڑے کی صورت بناؤ، "گڑ" کی ڈلی کہو تو کلمہ کی

بیچ کی انگلی اور انگوٹھا کو کھولکر ڈلی کی صورت بناؤ اور اس کہاوت کو جلدی جلدی کہو۔"

شہتوت کے پیڑ پر چڑی کی مالا، چڑی کی چونچ میں چینھٹرا کا لا، کیوں چڑی تیری چونچ میں چینھٹرا کا لا، یہ بھی ایک کہاوت ہے، بیگمیں توتلے بچوں سے اس کہاوت کو کہواتی تھیں اور جب بچے کچھ سے کچھ کہہ جاتے تھے اور ہکلاتے تھے تو وہ قہقہے پڑتے تھے اور وہ چہل ہوتی تھی کہ میں کیا کہوں۔

ایک بیگم اپنی صاحبزادی کو اس طرح بلاتی تھیں "بیوی تاجو تاج ملو کو سر پہ تاج نصرت بانو بیٹیاں شاہ بیویاں"

ایک دن محل کے چبوترے پر مرغا بھاگا پھرتا تھا کسی طرف سے بلی آئی اور مرغے کو زخمی کر گئی تو بیگم نے نصرت بانو کو اس طرح بلایا "بیوی تاجو تاج ملو کو سر پہ تاج نصرت بانو بیٹیاں شاہ بیویاں چھری لانا مرغا مرتا ہے"، اس خطاب کو پورا کرتے کرتے مرغا مر کر رہ گیا۔ اور چھری نہ آنے پائی۔

یہ ایک کہاوت قلعہ میں بولی جاتی تھی جب بچے کے منہ سے قاف صاف نہ نکلتا تھا اسے یہ کہاوت یاد کرائی جاتی تھی۔ اس کہاوت کو کہتے کہتے بچہ قاف اچھی

طرح سے کہنے لگتا تھا۔

"قاضی قوام الدین جی قربان بیگ کے قل پڑھنے جاتے ہو وہاں سے قلعہ قریب ہے، قلیمت سے کہیو کیا تو ناقصیں کی قید میں مقید ہے قصبہ کے قاضی قمی جی نے قاب قورمہ کی بھیجی ہے۔ قدم رنجہ کرو تو قوت قبول ہو۔"

قلعہ میں یہ کہاوت بھی لڑکیوں کی زبان پر تھی۔ "آگرہ کا ڈانڈ یہ برہان پور کی چھینٹ، پانی پت کے موتی نتھنی کے بیچ۔" یاد نہیں رہا کہ خانم صاحبہ نے ڈانڈیہ کے کیا معنی بتلائے تھے، غالباً کسی کپڑے کا نام ہے، برہان پور کی چھینٹ مشہور تھی، پانی پت میں سونے چاندی کے موتی بہت اچھے بنتے تھے جو زیوروں میں شمار ہوتے تھے اور اب بھی یہ موتی پانی پت میں بنتے ہیں۔

"پانچوں انگلیوں کی بات چیت بھی محلوں میں بولی جاتی تھی وہ یہ ہے" چھوٹی انگلی بیاہ کرو، بیاہ کرو۔ بیچ کی انگلی کہاں سے کریں کہاں سے کریں، بیچ کی انگلی، قرض لو، قرض لو، کلمے کی انگلی، کہاں سے دینگے کہاں سے دینگے، انگوٹھا، جئیں گے تو دینگے، جئیں گے تو دینگے۔"

کان گنہگار ہیں میں نے سنا کہ محبوب علیخاں خواجہ سرا اور شہر کے کئی اشراف

آدمی بلی بل کھلاڑیوں کو جوا کھلاتے تھے اور لاکھ لاکھ روپیہ کی بازی لگائی جاتی تھی اور جو شخص جیتتا تھا محبوب خاں اُس کی جیت کا روپیہ بہنگیوں میں لدوا کر اُس کے گھر بھجوا دیتا تھا۔ مرزا نوشاد (غالب) کی حیثیت اتنی بھاری بازی لگانے کی نہ تھی مگر ان کو ڈر نہیں خدا کے غضب سے ڈر۔ آخر کسی نہ کسی طرح مرزا صاحب اس مجلس میں پہنچ گئے۔ کوتوال جواریوں کی گھات میں لگا ہوا تھا۔ آج اُس کا داؤ لگ گیا۔ اُس نے سب کو پکڑ دھکڑ لیا۔ مرزا صاحب ان کے ماخوذ ہو گئے جب چالان عدالت میں پہونچے بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ۔ ڈپٹی صاحب جن کے ہاں مرزا صاحب کا مقدمہ پہونچا یہ نہایت کٹر قسم آدمی تھے، ان کا نام کنور وزیر علی خاں تھا۔ یہ دان پور ضلع بلند شہر کے تعلقدار اور سرکار کمپنی کے معتمد تھے، میرٹھ سے بدل کر شاہجہاں آباد آئے تھے کیونکہ غدر سے پہلے شاہجہاں آباد نظامت آگرہ سے تعلق رکھتا تھا، دلّی کے امیروں اور رئیسوں نے ڈپٹی صاحب کے پاس جا کر مرزا نوشہ کی سفارش میں بہت کچھ کہا سنا مگر کنور صاحب نے یہی جواب دیا کہ چاہے یہ کیسے ہی خاندانی اور نواب زادہ ہوں مگر میں ان کے حق میں وہی کروں گا جو قانون اور انصاف کر دے گا۔ کچھ دلّی والوں کو یاد رہے گا کہ لال خانی راجپوت کا چھوکرا شہر میں آیا تھا وہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر گیا اور آخر کار انہوں نے چھ مہینے کے لئے مرزا صاحب کو بندی خانے بھجوا دیا۔ شہر میں ہلکم مچ گئی۔ مرزا صاحب کو قید میں پڑے چند روز

ہوتے تھے جو اُن کی خوش نصیبی سے لاٹ یا اُن جیسا کوئی بڑا حاکم شاہجہاں آباد میں آیا اور مرزا صاحب کے عزیزوں نے اُس سے جاکر مرزا صاحب کی بپتا کہی اور اس نے اپنے اختیار سے مرزا صاحب کو فوراً چھوڑ دیا۔

ڈپٹی نذیر علی خاں ایک وضعدار اور طنطنہ کے آدمی تھے، شاہجہاں آباد میں مدت تک رہے اور شہر کے امیروں اور رئیسوں اور بادشاہزادوں سے راہ و رسم ہو گئی تھی، اُن سے یہ لوگ کہتے "ڈپٹی صاحب آپ اپنی گنواری بولی چھوڑ دیجئے اور ہماری اُردو سیکھ لیجئے" وہ جواب دیتے "ناجی جن ماں باپ سے ہم پیدا ہوتے ہیں ہم تو انہیں کی بولی بولیں گے۔ آپ کی اُردو آپ کو مبارک رہے، میں جانتا ہوں گھنٹا کہنا کانوں کو بُرا لگتا ہے اور گھٹنا فصیح ہے مگر میں گھنٹا ہی کہوں گا۔"
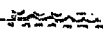
ممتاز محل کی کوکھ سے مرزا جہانگیر ناصر اکبر ثانی کے ایک بیٹے تھے، مزاج کا آگ تھا، سارا قلعہ اور شاہجہاں آباد ان کے نام سے پناہ مانگتا تھا۔ سیٹن صاحب ریزیڈنٹ کا قاعدہ تھا کہ وہ صبح کے دربار میں جہاں پناہ کے سلام کے لئے بلا ناغہ حاضر ہوا کرتے تھے، مرزا جہانگیر انہیں دیکھ کر کہا کرتے تھے "لو لو ہے لو لو" ریزیڈنٹ صاحب نے پہلے تو ان کے کہنے کا خیال نہ کیا۔ مگر کچھ دن بعد انہیں توجہ ہوئی اور انہوں نے قلعہ میں ہی لوگوں سے پوچھا۔ مرزا صاحب ہمیں دیکھ کر

لُوٹُو، لُولُو کیوں کہتا ہے، اسکے معنی ہم نہیں سمجھتے ہیں کیونکہ ہندوستان آئے ہمیں تھوڑے دن ہوئے ہیں۔ نمک حلال لوگوں نے کہا "حضور لُولُو عربی میں سچے موتی کو کہتے ہیں۔ صاحب عالم آپ کو سچے موتی سے مثال دیتے ہیں۔" مگر کچھ دن بعد کسی نے صاحب ریزیڈنٹ کو سمجھا دیا کہ لُولُو ایک فرضی بلا کا نام ہے جس سے بچوں کو ڈراتے ہیں، صاحب نے کہا "یہ معنی ٹھیک ہیں، مرزا جہانگیر بھی بچے ہیں ہم انہیں ضرور ڈرائیں گے۔" مرزا صاحب بڑے چھ بانک ہو گئے تھے اور انہوں نے سر سے کنواں کھود رکھا تھا، اماں باوا کے پاس بیٹھ کر ہر وقت لڑونی باتیں کرتے تھے اور ادنیٰ اعلیٰ سب کو سناتے تھے، ایک دن ریزیڈنٹ صاحب دربار سے قلعہ کے باہر جانا چاہتے تھے، مرزا جہانگیر نقارخانہ کی چھت پر کھڑے تھے، ہاتھ میں طمنچہ تھا، ریزیڈنٹ صاحب کے سر کو تاک کر طمنچہ مارا، مگر انگریزی اقبال گولی سے ٹوپی اڑ گئی۔ یہ ماجرا دیکھ کر لال قلعہ میں ہل چل مچ گئی، صاحب ریزیڈنٹ نے گولی کی کچھ پروانہ کی اور قلعہ میں ٹھہر گئے، چھاونی کو کہلا بھیجا اور آن کی آن میں گوروں کی پلٹن گوروں کے رسالے اور توپ خانے قلعہ میں داخل ہو گئے صاحب ریزیڈنٹ نے حکم دیا ؎

تم نہیں اور آہ تو سارا زمانہ ہیچ ہے   کیونکہ سب کو زمیں پہ تماشا ہو کوئی ہو

لال پردے کو اڑا دو، چنانچہ دو فیر آسمانی کئے گئے محلوں میں بیگمیں اور بادشاہزادے توپوں کی گرج سے کانپ اٹھے اور چیخ دھاڑ مچ گئی، صاحب

ریزیڈنٹ نے اکبر ثانی سے کہا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب اپنے دادا جان شاہ عالم کی طرح الہ آباد میں رہیں۔ ہم انہیں بادشاہوں کی طرح رکھیں گے اور انہیں سلطنت کے قاعدے سکھائیں گے، اب حضور والا اپنی چھاتی پر سل رکھیں اور شاہزادہ بہادر کو ہمارے حوالے کر دیں، توقع ہے کہ پورب کی آب و ہوا سے اُن کا مزاج دھیما ہو جائے گا۔ جہاں پناہ نے رو کر کہا کہ میں سرکار کمپنی اور اُس کے نوکروں کو اپنا دوستدار اور خیر خواہ جانتا ہوں مجھے یقین ہے کہ آپ لوگ میرے بچے کو کسی طرح کی اذیت نہ دینگے۔ دیکھئے مرزا میرے گاؤ تکیہ کے پیچھے چھُپا بیٹھا ہے، اسے بطور امانت آپکے سپرد کرتا ہوں"۔ جہانگیر اپنے ماں باپ سے رُخصت ہو کر ریزیڈنٹ کے ساتھ ہو لئے۔ یہ جدائی، یہ فراق، یہ صدمہ، یہ درد، لال قلعہ میں شورِ قیامت برپا تھا۔ محل کے دروازے کے باہر جٹا فینس تیار رکھی تھی، ریزیڈنٹ صاحب نے شہزادے کا ہاتھ پکڑ کر پینس میں بٹھایا، اور پلٹنوں اور سواروں اور توپوں کی حراست میں اُنہیں چھاؤنی پہنچایا گیا، اِس معرکہ کا شہر میں ایک گیت بھی بنایا گیا تھا جو لال قلعہ اور شہر میں گایا جاتا تھا، صاحبہ محل بوحہ نے اس ناکارہ فراق کو گیت گا کر سُنایا تھا، اُس کی استھائی مجھے یاد ہے مگر انترے یاد نہیں رہے اور کیونکر رہ سکتے تھے ۹ میری عمر سُننے کے وقت بہت کم تھی تاہم جو کچھ یاد ہے وہ لکھے دیتا ہوں۔

اودھورا گیت

سیٹن کو ٹو ٹو کیوں کہا مرزا — لال پردے سے گولہ بچگیا مرزا
رجمنٹیں بھی آئیں پلٹنیں بھی آئیں — لال پردے سے گولہ بچگیا مرزا
سیٹن کو ٹو ٹو کیوں کہا مرزا

فرنگیوں نے مسکوٹ کر کے یہ ٹھیرا لیا کہ مرزا کو شاہانہ طور پر الہ آباد میں رکھا جائے، چوتھے روز سفر کا سامان ٹھیک کر لیا تو ایک ہزار فوج اور فوج کے علاوہ ہاتھی گھوڑے، اور کئی سو آدمی بادشاہزادے کی خدمت کے لئے ساتھ لے کر بادشاہزادے کو الہ آباد کی طرف لے چلے۔ بادشاہزادے نے کہا کہ پہلے میں لکھنؤ کی سیر کرنی چاہتا ہوں۔ صاحب نے کہا ضرور ملاحظہ فرمائیے، نواب سعادت علی خاں کو خط سے خبر دی گئی، سعادت علی خاں نے جواب میں لکھا زہے نصیب مجھ فدوی نمک خوار کے کہ مرشدزادہ میرے جھونپڑے پر تشریف لائیں، بادشاہزادہ لکھنؤ پہنچا تو نواب صاحب نے پیشوائی کی تمام فوج اور ریاست کے سب رکن اور جان بیلی صاحب اور مرزا سلیمان شکوہ ساتھ تھے مغلیہ کے دستور کے موافق بادشاہزادے کو ہاتھی پر عماری میں آگے بٹھایا آپ خواصے میں مورچھل لیکر ہلاتے چلے۔ کیا بتاؤں کہ اس بیچارے نے بادشاہزادے کی کیا آؤ بھگت کی، روپیہ اشرفی، جواہر سے دریغ نہ کی مگر بادشاہزادے ...

نے اپنی عادت کو نہ بدلا۔ وہی چھچھوری باتیں کرتے تھے جنہیں دیکھ کر نواب سعادت علی خاں اور اُن کا سارا گھرانہ اور سب فرنگی پانی پانی ہو جاتے، اشرف علی خاں حضرت کے وزیر تھے جو ستار بجانے کا پیشہ رکھتے تھے، وزیر صاحب کو صبح ہی نواب صاحب کے پاس بھیجتے تھے تاکہ خیریت معلوم کرائیں۔ وزیر صاحب کے آنے سے پہلے نواب صاحب اپنی کوٹھی میں ٹہلنے لگتے تھے کیونکہ اگر نواب صاحب کو بیٹھا پاتے تو آپ بھی بیٹھ جاتے، اس پر بھی وہ آتے ہی کہتے اسلام علیکم نواب خبردار رہو کر کہتے وعلیکم السلام۔

لکھنؤ میں دو چار روز ہی رہ کر بادشاہ زادے صاحب ڈسپیٹ ہو گئے۔ صبح گھوڑے پر چڑھ کر لکھنؤ کے گلی کوچوں میں اور بازاروں میں چکر لگاتے۔ بچے، عورتیں، کمزور، بوڑھے مرزا صاحب کے گھوڑے کی جھپیٹ میں آ جاتے گھائل ہو کر گر پڑتے مگر زبردست مارے اور رونے نہ دے۔ ایک بے چارہ کبھی اُف نہ کرتا۔

ایک دن صبح ہی جا کر نخاس میں ننگے گھوڑے کو کاواٹیرن پھراتے اور لوگوں کو اپنے اوپر ہنسواتے۔ چپکے چپکے لکھنؤ کی ایک ذلیل کنجنی سے جس کا نام دمڑی تھا نکاح کر لیا۔ اب نواب صاحب کو تاب نہ ہوئی اور انہوں نے صاحب ریزیڈنٹ سے کہا، "یہ مثل سچ ہو گئی ؎

رات وہ مجھ سے ہنس کے کہتے چاہ میاں کچھ نہیں ۔ میں ہوا [illegible] مقطع [illegible]

بادشاہزادے کا چال چلن دلّی سے زیادہ یہاں آکر بگڑ گیا ہے، ایسا نہ ہو کہ بادشاہزادے صاحب کوئی ایسا کام کر بیٹھیں جو جہاں پناہ کے آگے میرا منہ کالا ہو اور لینے کے دینے پڑ جائیں، اب میری خطا معاف فرمائی جائے اور انہیں الہ آباد دے جائیے، کیا عجب ہے کہ اپنے بزرگ خسرو جہانگیر کے بیٹے کی قبر کو دیکھکر عبرت پکڑیں۔"

ڈاک کا انتظام ہوگیا، راتوں رات صاحب عالم بہادر الہ آباد پہونچا دئے گئے اور خلد آباد میں ٹھیرائے گئے، الہ آباد میں پہنچتے ہی کھل کھیلے اور یہاں اُن کے ہی ہتھکنڈے تھے، سارا شہر تراہ تراہ کہنے لگا۔ شہر کے بازار میں کوٹھے پر بیگا نام کی ایک پُرانی کنچنی رہتی تھی۔ اسکی سو نوچیاں تھیں، جنہیں بیگا نے خوب تمیز سکھائی تھی، وہ پریوں کا پرہ روزانہ برآمدہ میں بیٹھا کرتا تھا اور ہزاروں انکی ایڑی چوٹی پر سے قربان ہوتے رہتے تھے، اتفاقاً مرزا جہانگیر کا بھی اُدھر سے گذر ہوا اُس میں سے ایک پری کی موہنی مورت آپ کو پسند آگئی۔ گھوڑا سائیس کو دے کر کوٹھے پر پہنچے، بیگا نائیکہ سلام کرکے اور ہاتھ جوڑ کے اُن کے آگے کھڑی ہوگئی، انہوں نے جاتے ہی اُس نوچی کا ہاتھ پکڑ لیا جو دل پر چڑھ گئی تھی اور اُسے لے کر کوٹھے سے نیچے اتر سے پہلے آپ گھوڑے پر سوار ہوئے پھر کنچنی کو گھوڑے پر بٹھایا، گھوڑے کو ایڑ بتائی۔ گھوڑے کی جو بوجھ سے مینڈ کی دبی تو وہ شرارے کی طرح اُڑا اور خلد آباد میں جا ٹھیرا۔

ادھر بیگا نایکہ ہکا بکا رہ گئی، وہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی کہ الٰہی یہ شاہباز کہاں سے آ کر گرا اور سونے کی چڑیا کو پنجہ میں دبوچ کر کس طرح لے گیا۔ روتی پیٹتی خلد آباد پہونچی، مگر دروازے پر پہرا لگا ہوا تھا، پرندہ پر نہ مار سکتا تھا۔ صاحب عالم کے نوکروں نے کہا نائکہ جی ٹھنڈے پیٹوں تشریف لیجایئے، اور اگر آپ نے اور پاکھنڈ پھیلائے تو جان کی خیر نہ کھال کی۔ مارے زیر بندوں کے چمڑی اُڑ جائیگی اور ادھ موئی ہوجاؤ گی، بڑھیا بیسوا چار و ناچار روتی پیٹتی خلد آباد سے چلدی، راستہ میں اُسے ایک فرنگی ملا جو گھوڑا اُڑائے چلا آتا تھا۔ دراصل یہ فوجی افسر تھا، اُسے دیکھ کر بیگا کھڑی ہوگئی، اور ٹسوے بہا کر کہا۔ "دُہائی ہے صاحب کی"۔ اور اس شہکارہ نے وہ غل مچایا کہ صاحب حیران ہوگئے اور گھوڑا روک کے کہا۔ "ول تم کیا بولتا ہے، کیا مصیبت ہے؟" بیگا نے نوچی کے لیجانے اور مرزا جہانگیر کے ستانے کا حال کچھ اس درد سے کہا کہ صاحب کے دل پر نقش ہوگیا، اُس نے کہا کہ ہم فوجی محکمہ کے نوکر ہیں، ہم ایسی باتوں میں دخل نہیں دے سکتے ہیں مگر ہم کو تمہارے رونے دھونے پر ترس آگیا۔ کل ہم بادشاہزادے صاحب بہادر سے جا کر ملیں گے اور تمہاری بیٹی کو ان کے پنجہ سے نکلوا دیں گے۔ کل صبح ہی تم ہمارے بنگلے پر یاد دلانا، اور دوسرے دن بیگا نے جا کر صاحب کو سلام کیا صاحب نے مرزا جہانگیر کی خدمت میں خط بھیجا، ملنے کی آرزو، ملنے کا وقت دریافت کیا، جواب آیا کہ کل صبح آٹھ بجے دولت خانہ شاہی پر آجایئے۔

صاحب خوش ہو گئے اور آٹھ بجے ٹھیک قلعہ آ دھمکے۔ ایک نوکر نے کسی مکان میں صاحب کو پہنچا دیا اور ایک چرخ چوں کرسی ڈال کر اس پر تشریف رکھنے کو کہا۔

صاحب کو کرسی پر بیٹھے بیٹھے آٹھ بجے سے بارہ بج گئے، صاحب انتظار میں ہیں کہ اب بلاوا ہوتی اب بلاوا ہوتی، مگر بلاوا کیسی کوئی بھی پاس آکر نہ پھٹکا، نہ پانی نہ پانپ، نہ چرٹ، وقت کیوں کر کٹتا؟ اس پر بھی دو بج گئے جب کہیں جا کر ایک چوبدار آیا اور صاحب کو محل میں لے گیا۔ صاحب نے دیکھا کہ شاہزادہ صاحب کمرے میں ٹہل رہے ہیں، صاحب نے سلام کیا اور بادشاہزادے نے سلام لیکر کہا "ملاقات ہو گئی تشریف لے جائیے" صاحب الٹے قدموں لپنے دل میں اپنے تیئں نفریں کرتے باہر آئے اور گھوڑے پر سوار ہو کر بنگلہ پہنچے، دیکھا تو بیگا موجود ہے۔ صاحب بیگا کو دیکھ کر مارے غصے کے آگ ہو گئے اور کہا "ول عورت تم بڑا مکار ہے، تم نے ہم کو دھوکا دیا۔ ہم بے ضرورت بادشاہ زادے سے ملنے گئے اور بہت شرمندہ ہو کر اس کے پاس سے آئے اور آٹھ بجے سے دو بجے تک تکلیف الگ جھیلی۔ ہمارے بنگلہ سے ابھی نکل جاؤ" بیسوا اپنا سا منہ لے کر پلٹ کر اپنے گھر پہونچی اور اپنی لوچی کا سوگ کرنے لگی۔

آٹھویں دن وہ اُنکی لوچی کبھی سر چھپائے منہ پھاڑے اُن کے پاس پہنچی، اُسے دیکھ کر بیگا نے خدا کا شکر ادا کیا اور کہا "اے میری بچی میں واری گئی تو شاہزادے کے ہاں ابھی تو رہی"

نوجی نے رو کر کہا "اماں جی کچھ نہ پوچھئے۔ میں سمجھی کہ لڑکا مجھ پر ریجھ گیا ہے اب میں آسانی سے اپنے پھندے میں پھنسا لوں گی۔ میں نے بل کھانے اور چونچلے دکھانے شروع کئے اور کلمہ کی انگلی اٹھا کر بادشاہزادے سے کچھ کہا۔ میری انگلی کے اشارے کو دیکھ وہ تو آپے سے باہر ہو گیا اور دہلیز میں آکر اس نے کہا "کوئی ہے" بس اسی آن میں پچاس نوکر ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے اور کہنے لگے کیا حکم ہے پیر و مرشد۔ اس غارتی نے کہا "یہ کنچنی بادشاہوں کی صحبت کے قابل نہیں، ہماری طرف انگلی اٹھاتی ہے۔ اچھا جس انگلی کو اس نے اٹھایا ہے وہ انگلی اس کی جڑ سے قلم کر دو" اور اس کے ساتھ ہی وہ پیچھے دالان کا لیاں دیں کر لی۔ اماں میں کیا کہوں، بس حکم کی دیر تھی۔ میں نوکروں نے جو دلی کے پہلوان ڈنڈ پیل سنڈ مسنڈے تھے اور بڑے موٹے تازے ارنا بھینسا بنے ہوئے تھے، مجھے دبوچ لیا اور ایک جرّاح نے جھٹ میرے ہاتھ کی انگلی کاٹ لی میں بہت سی چیخی چلائی تڑپی، مگر موئے قسائیوں کے کان پر جوں نہ رینگی۔ جب انگلی کٹ لی تو پھر جلتا تیل زخم پر چھڑکا اور پٹی باندھ دی [illegible] گیا تو پھر کچھ ہوش آگیا اور موئے جلادوں نے اپنی آنکھ سے دیکھ لیا تو حکم دیا کہ اس جوگنی کو محل سے نکال دو۔ میں محل سے نکلی تو پاؤں سر پر رکھ کر بھاگی اور یہاں آکر دم لیا۔ ہائے ہائے اماں اس بے دردی کی انگلی اب کہاں سے آئے گی؟"

بیگم نے کہا "واری گئی انگلی تو اب کہاں، مگر یہ کیا کم جیت ہے کہ تو صحیح سلامت ہم تک پہنچ گئی، میں سونے کی جڑاؤ انگلی بنوا کر چڑھوا دونگی، صبر کرو مو‌ئے کی جان کو۔"
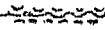
مرزا جہانگیر کا مزاج کبھا کب درست ہونے والا تھا، نہ ہوا پر نہ ہوا۔ بوتل والی کا شوق اپنے پردادا شہنشاہ جہانگیر کی طرح بڑھا لیا۔ گلاس پر گلاس پیتے تھے، دن رات میں خدا جانے کتنے قرابے ڈھل جاتے تھے یہاں تک کہ ایک دن پیتے پیتے بدمست اور بدمستی میں ہنسی آئی تو ایسی آئی کہ جب تک دم نہ نکل لیا رکی نہیں۔ اِنا للہ و انا الیہ راجعون ؎

یاد داری کہ وقت زادن تو　　　　ہمہ خنداں بدند تو گریاں

آنچناں زی کہ بعد مردن تو　　　　ہمہ گریاں بوند تو خنداں

جب دہلی سنادنی پہونچی تو لال قلعہ اور شاہجہاں آباد میں کہرام مچ گیا، اکبر بادشاہ نے الہ آباد حکم بھیجا کہ اس لخت جگر کی میت کو نہلا دھلا کر تابوت میں بند کر کے باغ میں رکھا جائے، جب یہاں مقبرہ تیار ہو جائے گا تو تابوت وہاں سے منگا کر یہاں میت دفن کی جائے گی اور دارالامام ایک سنگتراش کو بلا کر ارشاد کیا کہ حضرت سلطان جی کی درگاہ میں محمد شاہ بیا کے مقبرے کے سامنے سامنے حضرت امیر خسرو کی رسوائی کو جانیکا راستہ چھوڑ کر سنگ مرمر کی جالیوں کا

ایسا مجھر بنا دو جیسا محمد شاہ پیا کا مجھر ہے۔ وہی گل بوٹے ہوں، وہی شبکہ ہوں
ویسی ہی چوکھٹ، ویسے ہی سنگ مرمر کے کواڑ اور کواڑوں کے وہی نقش و نگار ہوں۔

دلارام اپنے نام کا ایک ہی استاد تھا۔ چند روز میں اس نے مجھر بنا لیا
ابھی پتھر کھدے کھدائے زمین پر پڑے ہوئے تھے جو جالی کی دیوار اتنی کی قدر
سے مارے نزاکت کے ٹوٹ کر رہ گئی، دلارام اپنا کلیجہ پکڑ کر رہ گیا کیونکہ وہ
جالی کم از کم پچاس ہزار روپے کی لاگت میں پڑی تھی۔ دوبارہ بنانے کا خرچ
بادشاہ کیوں دینے لگے تھے اور سزا تو لازمی ہے جب اسے کچھ اور بن نہ پڑی
تو وہ حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کے روضہ پر حاضر ہوا، اور آپ کے
مزار کے سامنے پگڑی ڈال ڈال کر زار زار رویا اور گڑگڑا کر کہا "یا محبوب الٰہی
آپ اللہ کے پیارے بندے ہیں، دعا کیجئے کہ میری ٹوٹی ہوئی جالی کھڑی ہو
جائے اور اپنے موقع سے لگ جائے، میں منت مانتا ہوں کہ اگر آپ کی دعا سے
میری مراد بر آئی تو میں آپ کے گنبد کے کلس کے نیچے سنگ مرمر کے ایسے پتے
تراش کر لگاؤں گا جو بے نظیر ہونگے۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ وہی ٹوٹی جالی کی
ٹوٹی دیوار بے لاگ کھڑی ہو گئی اور اب تک کھڑی ہے جس کا جی چاہے یہ کرشمہ
مرزا جہانگیر کے مجھر کی اُتر کی جالی میں جا کر دیکھ لے، دلارام نے اپنی منت پوری
کی اور حضرت محبوب الٰہی کے گنبد پر ایسے پتے سنگ مرمر کے جڑے کہ اصلی
دیکھنے والے اس کاریگری کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔

مرزا جہانگیر کا جنازہ الہ آباد سے چلا تو الہ آباد سے لے کر شاہدرہ تک جتنے
شہر اور قصبہ اور گاؤں راستہ میں پڑے وہاں کے رہنے والوں نے جنازہ
کا استقبال کیا، دو رویہ قطاریں باندھ کر عورت مرد کھڑے ہو جاتے تھے اور
تابوت پر پھول برساتے تھے اور مرزا کے ماتم میں اپنے گریبان چاک کرتے تھے۔
کئی انگریز اور بہت سی فوج تابوت کے ساتھ تھی، جب تابوت سوروں مقام
پر پہونچا جہاں گنگا کا بڑا تیرتھ ہے تو وہاں کے رہنے والوں نے درخواست
کی کہ ایک رات ایک دن تابوت یہاں ٹھیرا لیا جائے۔ یہ ہمارا بادشاہزادہ ہے
ہم اس کی پوجا کریں۔ جس وقت جنازہ شاہجہان آباد پہونچا تو بادشاہی
فوج نے پیشوائی کی اور سارا شہر ماتم اور تماشہ کیلئے اُمنڈ آیا، روشن چوکی والے
اور نفیری اور شہنائی والوں نے جنازے کے آگے بڑھ کر شہنائیوں میں یہ شعر
بجانا شروع کیا۔

سرو سیمینا بصحرا می روی — سخت بے مہری کہ بے ما می روی

جب اس شعر کی نوبت آئی۔

دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست — تا نہ پنداری کہ تنہا می روی

پالکی اور نالکی اور رتھوں میں جو بیگمیں سوار تھیں انہوں نے اس قدر
واویلا کیا اور اتنا اپنا آپا پیٹا کہ سننے والوں کے کلیجے پھٹ گئے، اکبر ثانی اور
ممتاز محل (جہانگیر کی ماں) کو غش آگیا، اسی طرح روتے پیٹتے لاش محبوب باک

LYTTON LIBRARY
ALIGARH
MUSLIM UNIVERSITY

کے آستانے پر پہنچی اور خاک کو سونپی گئی۔

فراق دہلوی عرض کرتا ہے۔ تاریخ کہتی ہے کہ اس بادشاہ کو ایکسو بائیس برس ہوگئے کیونکہ مرزا جہانگیر صاحب نے ۱۸۱۰ء میں مسٹر آرچی بالڈ سیٹن صاحب پر طمنچہ کی گولی ماری تھی اور اسی سال وہ الہ آباد بھیجے گئے اور بارہ تیرہ برس وہاں رہے اور ۱۸۲۲ء میں فوت ہوئے۔ یہ بھی سنا ہے کہ لاش پہلے آگئی تھی۔ مقبرہ پیچھے بنا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ بیشک ؎

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش   باز جوید روزگار وصل خویش

بی خانم صاحبہ نے فرمایا اکبر ثانی کے عہد میں دریا کے گھاٹ پر دھوبی دھوبی آپس میں لڑے۔ ایک نے دوسرے کی خوب گندی کی اور صابون کے بجائے پڑپکیں تو خون میں نہلائے۔ لال قلعہ میں آئے اور حضور میں فریاد کی۔ بادشاہ سلامت نے فرمایا "دھوبیوں سے کہدو ہماری حکومت دریا پر نہیں ہے قلعہ میں ہے — فرنگیوں کے پاس جاؤ اُن کے قبضہ میں جمنا ہے"

اکبر ثانی کے حضور میں پرچہ گذرا کہ آج شاہجہاں آباد میں شہر والوں نے ۔۔۔ھٹ بنگیوں کو خوب مارا پیٹا۔ کیونکہ ۔۔۔ نوں کا قاعدہ ہے کہ جب وہ شہر میں

سبجھیری بھیرلے آتے ہیں تو آواز لگاتے ہیں۔ کھاٹ بُنا لو کھاٹ، کھاٹ بُنا لو کھاٹ۔ شہر والوں نے کہا کہ نکلے تمہاری کھاٹ۔ یہ کیا بُری فال مُنہ سے نکالتے ہو۔ پھر جو نہیں بیٹا ہے تو بیٹھے بیٹھے جھلنگا بنا دیا اور اس ٹکسال باہر لفظ سے توبہ کروائی اور سمجھایا کہ بجائے کھاٹ بُنالو کے چارپائی بُنا لو کہا کرو۔ چنانچہ جب سے اب تک کھٹ بُنے چارپائی بُنا لو ہی کہتے ہیں۔ اس تکلف و تنبیہ اور تدبیر سے اردوئے مُعلّٰی کو سنوارا گیا ہے۔ ورنہ اردو کو چار چاند نہیں لگ سکتے۔

ان کھٹ بُنوں کی ایک صفت قابلِ رشک یہ ہے کہ شاہجہاں کے عہد سے آج تک ان کا کسی قسم کا مقدمہ کبھی عدالت شاہی میں نہیں آیا۔ ان کا سرگروہ جو چودھری کہلاتا ہے، وہی چُکا دیتا ہے۔

میں ایکبار لال قلعہ سے چھٹی لے کر تمہارے گھر بارہ دری میں آئی تو میں نے پرنانی بی امانی بیگم میرزا عمریان صاحب کی بیوی کے پاس ایک ولایتی مغلانی تہان دیکھیں، وہ حضرت صاحب کی مُرید تھیں اور سبزی منڈی کے مغلپورہ سے آئی تھیں۔ بیگم صاحب نے مجھ سے کہا ٹھیرو میں تمہیں انکی اردو بولی سنواؤں۔ نرگس ونڈی کو اشارہ کیا، وہ انہیں صحنچی میں سے بلا لائی۔ آ میں آداب بجا لائیں، مجھے بیگم صاحبہ پہلے سمجھا چکی تھیں، میں نے کہا "خانم بی سبزی منڈی سے کیونکر تشریف لائی ہیں؟"

خانم بولیں" ہم نے سُنا کہ مینہ کے طوفان سے دریا چڑھ آیا ہے، سبزی منڈی آج ڈوب جائیگا۔ ہم ڈر سے روتا تھا اور مینہ کی طرف مُنہ کرکے اور ہاتھ اُتار کر کہتا تا یا حجرت بیوی ڈور ہ چودہ آدمی ڈوبتا ہے۔ ہم جانتا تا کہ جب ہم مریگا تو ہمارے مُنہ میں سربت پڑیگا۔ ہم نہیں جانتا تا کہ ہم مرے گا تو ہمارے مُنہ میں تمام عالم کا گو پڑیگا"

رات ہوئی تو میاں ناصر نذیر تمہاری اماں جان نے جو اُس وقت تم سے بھی چھوٹی تھیں خانم بی سے کہانی کی فرمائش کی اور خانم بی نے کہانی اِس طرح شروع کی :-

خانم بی:" ایک طوطا تی ایک طوطی تا۔ دونوں میں لڑائی ہوا، طوطہ نے طوطی کا پَر پَر پَڑ جا پڑ جا کر ڈالا۔ جیسا خدا نے اُن دونوں کا کسمت پھیرا خدا ایسا کبھی سنتوں کا کسمت پھیرے"

مُرشد زادی کے سامنے ہنسنا گناہ تھا، مگر بی خانم کی اُردو اور طوطے کی کہانی سُن کر میں پھڑک گئی اور ہنسی روکنی دشوار ہوگئی۔ اب میں تمہیں یہ بھی سمجھا دوں کہ نرگس جو خانم بی کو بلانے گئی تھی کس کی لونڈی تھی، وہ تمہاری اماں کے جہیز کے لئے تمہارے نانا جان نے پانچ برس کی عمر کی لی تھی، جب بیچنے والا بیچ کر چلدیا تو معلوم ہوا کہ لڑکی گونگی ہے اس واسطے یہ نہ بتا سکی کہ میں اِس قوم کی ہوں مگر قرینہ کہتا تھا کہ کمہار کی ہے کیونکہ جب اس کا جی چاہتا تھا تو مٹی سے

رسا کھلونے اور ہاتھی گھوڑے بہت خوبصورت اور قاعدہ سے بناتی تھی۔ بیگم صاحبہ نے پہلے اُسے کلمہ سکھایا، مگر رسول اللہ کے بدلے کسول اللہ کہتی تھی "ر" اُسکے مُنہ سے نہیں نکلتی تھی۔ کلمہ کے علاوہ دو چار ٹوٹے پھوٹے اور بول اُس کے مُنہ سے نکلتے تھے۔ بس پانچوں وقت کی نماز اشاروں سے پڑھتی تھی، زردہ، بریانی، متنجن، مزعفر اور سب طرح کے مربّے خوب تیار کرتی تھی، چکن، بانبیٹ، دیکھیتا، کھولی، کلابتون، ٹدوری اور سب قسم کی سلائی کی اُستاد تھی بیگم صاحبہ بیٹی کی طرح رکھتی تھیں۔ جو آپ پہنتی تھیں وہ اُسے پہناتی تھیں جو خود کھاتی تھیں وہ اُسے کھلاتی تھیں۔ غدر میں تمہاری اماجان کے ساتھ پروانہ کی شہ تھی، اُسکے لنگوٹ میں ایک نیم سونے کی جس میں دو سچے موتی دس ہزار کے مول کے اور ایک جوڑی مگر چوداہیوں کی زمرد اور یاقوت اور ہیروں کی جڑاؤ تھی جس کا مول بھی بیس ہزار سے کم نہ تھا بندھا ہوا تھی تعلق آباد میں سب سامان گوجروں نے لوٹ لیا مگر نرگس کے پاس نتھ اور مگر چوداہیاں بچ گئیں اور جب تمہاری منجھلی بہن کی شادی گلاوٹھی جاکر رچائی گئی تو اُس کے تین مہینے بعد تمہارے گھر میں گوجروں نے بڑی بھاری چوری کی اور خواجہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے وقت کا وہ تبرک بھی اُڑا لے گئے۔ نرگس غدر کے آٹھ برس بعد تک جیتی رہی، دس دس پندرہ روز بیس لیتی تھی، آخر اُسکے گلے میں گلٹیاں پیدا ہوگئیں اور دُنیا سے جنّت کو سدھاری۔

شریف خاں صاحب دلی کے مشہور حکیم اور لال قلعہ کے بادشاہوں کے معالج تھے، ایکدن اپنے دیوان خانہ میں بیٹھے کچھ مکان بنوانے کی فکر میں تھے۔ اور دل ہی دل میں حساب لگا رہے تھے تیسرا پہر تھا جو ایک بیمار آیا اور اُس نے کہا کہ اس شخص کو ہول دل کی بیماری ہے، حکیم صاحب نے اُسکی نبض دیکھ کر یہ نسخہ تجویز کیا۔

ہوالشافی

بارہ کڑیاں نوستون روپے کے وزن میں لپیٹ کر کھا جاؤ۔

بیمار نسخہ لے کر عطار کی دوکان پر پہونچا، عطار نے نسخہ پڑھکر کہا اسمیں یہ لکھا ہے، حکیم صاحب سے جا کر پوچھ، بیمار نے آکر اور ہاتھ جوڑ کر کہا حضور فدوی کا اتنا بڑا حلق نہیں ہے جو بارہ کڑیاں اور نوستون نگل جائے، حکیم صاحب نے اُس کے ہاتھ سے نسخہ لے کر پڑھا اور بہت ہنسے اور نسخہ بدل دیا۔

صدر الصدور مفتی صدر الدین صاحب کو صدر الصدوری کی تنخواہ سرکار کمپنی کئی سو روپیہ دیتی تھی، اور بادشاہ سلامت کے خزانہ سے مفتی کے منصب کے دو روپیہ آٹھ آنے ملتے تھے، وہ بھی محبوب علی خاں خواجہ سرا نے وزیر ہو کر بند کر دیئے، مفتی صاحب نے بادشاہ سلامت کے ہاں ڈھائی روپیہ کا مقدمہ دائر کیا اور باقاعدہ مقدمہ لڑا کر ڈھائی روپے جاری کروائے۔ صاحب کمشنر دہلی نے مفتی صاحب سے کہا آپکو ہماری سرکار ہزار روپے سے اوپر دیتی ہے

دلی آپ نے ڈھائی روپے کے لئے اتنی کیوں کھکیڑ اٹھائی؟ مفتی صاحب نے کہا آپ کے ہزار بارہ سو روپے پر ڈھائی بھاری ہیں یہ تبرک ہے، اس پہ ہمیں فخر ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی رضی اللہ عنہ کے آستانہ کا یہ خاصہ ہے کہ جو مراد مند آپ کے مزار کے سامنے جاگ کر طہارت کے ساتھ نو راتیں کاٹے اور بغیر ضرورت کے دن میں بھی درگاہ شریف سے باہر نہ آئے تو باذن اللہ تعالیٰ وہ شخص اپنی مراد پا لیتا ہے اور اس عمل کو حضرت نظامیہ نوراتہ کہتے ہیں۔

محمد شاہ رنگیلے کی والدہ قدسیہ بیگم کو اپنے بچے کے بادشاہ ہونے کا بڑا ارمان تھا، مگر من بھائے مُنڈ یا ہلائے، بادشاہت کے نام سے تیوریاں چڑھاتی تھیں اور فرماتی تھیں "روشن اختر کو خدا تخت طاؤسی کی ہوا بھی نہ لگائے، چاہے گھاس کھود کر اپنا پیٹ بھرے، مگر سلطنت کے پیچھے اُس کے دشمنوں کا بال بھی بیکا نہ ہو۔ جہاں روشن اختر کی دائی بندی نے ہاتھ دُھوئے، وہاں لال قلعہ اور ہندوستان کے تخت و تاج کو سات دفعہ قربان کر ڈالوں"۔ مگر بیگم صاحبہ (قدسیہ بیگم) سے رہا نہ گیا۔ سلطان جی کے صاحبزادوں کو کہلا بھیجا کہ درگاہ شریف کو زنانہ کیا جائے، میں نوراتہ کروں گی اور ڈیرہ تنبو درگاہ کے باہر بھی لگائے گئے اور درگاہ کے صحن میں بھی مناسب جگہ چھوٹا سا خیمہ کھڑا کیا گیا۔ تاکہ آرام دے

پہلی رات آئی بیگم نہادھو روشن اختر (محمد شاہ) کو جن کی عمر چار برس سے کچھ کم تھی، اپنی گود میں لے کر حضرت امیر خسرو کی راوٹی کو پیٹھ دے بست دری کے سامنے عین حضرت کی چوکھٹ کے نیچے مؤدب بیٹھ گئیں، درگاہ کے سامنے اندر عنبریں شمع اور کافور کی بتیاں جل رہی تھیں خوشبو اُڑ رہی تھی مگر درگاہ میں سوائے ان دو ماں بیٹوں کے کوئی زندہ آدم اور نہ تھا۔ اگرچہ آستانہ کے چاروں طرف کئی سو سپاہیوں کا پہرہ تھا مگر بیگم کا کلیجہ ڈر کے مارے بلیوں اُچھل رہا تھا اور اس تصور سے جان گھلی جاتی تھی کہ جہاں آرا بیگم اپنے مرقد سے سفید کفن پہنے نکل میرے سامنے آن کھڑی ہونگی۔ مگر حضرت محبوب پاک نے مدد کی اور یہ سب وہم دل سے مٹ گیا اور مقصد کے دھیان میں ڈوب گئی اور آن کی آن میں صبح ہو گئی اور یہ نماز پڑھ بچّہ کو گودی میں اُٹھا اپنے آرام گاہ میں چلی گئیں۔ اس طرح آٹھ راتیں خیر سے کٹیں۔ نویں رات کو روشن اختر اپنی ماں کی گود میں اندھے پڑے اپنا سر حضرت محبوب الٰہی کی پتھر کی دہلیز پر رکھے سو رہے تھے جو یکایک چونکے اور کہنے لگے "اماں حضرت میں نے ایک خواب دیکھا ہے"

بیگم:- خیر لنا و شر لا علانا۔ جان من قربانت شوم کیا دیکھا۔

روشن اختر:- میں نے دیکھا کہ محبوب الٰہی کی اسی دہلیز پر جہاں اپنا سر ٹیکے لیٹے ہوں ایک تل پڑا ہے، وہ تل میں نے زبان سے اُٹھا کر کھا لیا، بڑا مزیدار اور خوشبودار تھا۔ بس میری آنکھ کھل گئی"

قدسیہ بیگم! عمر دراز مبارک ہو، ہندوستان کی تل بھر سلطنت جو بچی کچھی ہے
وہ حضرت نے تمہیں بخش دی۔ انشاء اللہ تم بادشاہ ہو کر رہو گے، نوراتہ خوب
پورا ہوا۔"

کہا جاتا ہے کہ روشن اختر بندی خانہ سے نکالے گئے اور بادشاہ بنائے
گئے یہی وجہ ہے کہ روشن اختر محمد شاہ رنگیلے حضرت محبوب الٰہی کے ساتھ خاص
عقیدت رکھتے تھے، مرنے کے بعد بھی حضور کے قدموں میں رہے۔

فقیر فراق عرض کرتا ہے کہ اس ناچیز کو بھی نوراتہ کا شوق ہوا اور میں نے
سید حسن علی شاہ صاحب مرحوم خواجہ سید حسن نظامی کے بڑے بھائی سے
تذکرہ کیا۔ سید صاحب مرحوم میرے ساتھ برادرانہ اُلفت رکھتے تھے۔ اُنہوں نے
مجھے نوراتہ کے لئے بالکل آمادہ کر دیا۔ میں نے کہا اکیلی درگاہ میں ساری رات
تنہائی میں کیونکر کٹے گی۔ فرمایا محبوب پاک کے تصدق سے کوئی مشکل اڑی نہ رہے گی۔
آپ گھر جائیے اور کہہ آئیے کہ دس دن میں سلطان جی میں رہونگا، گھبرانا نہیں۔
چنانچہ میر حسن علیشاہ صاحب کی توجہ سے نوراتہ شروع ہو گیا۔ میر صاحب بستر تکیہ کھانا
پینا اپنے گھر سے لاتے تھے، راتوں کو دو دو بار درگاہ میں آتے اور کہتے میر صاحب
ڈرنا نہیں، محبوب پاک کا دستِ شفقت آپکے سر پر ہے۔ یہاں تک کہ نوراتہ
میں نے پورا کر لیا اور میں اپنی مراد کو پہنچ گیا۔ میر صاحب سے میں نے کہا میرا دل
چاہتا ہے کہ بعد ہر دن بھی آپکے پاس رہوں۔ فرمایا اگر آپ دلّی میں رہیں گے تو ہم بھی

لاش سلطان جی لے آئیں گے اور اگر دہلی سے باہر مرے تو ہمارے بس کی بات نہیں کیونکہ آپ ٹھیرے سیاح، پول کے پوت نپال کے راجہ مگر افسوس میر حسن علیشاہ مجھ سے پہلے سدھار گئے ؎

سلامی غم ہجر یہاں رہ گیا میں تنہا پسِ کارواں رہ گیا

اب میرا یہ حال ہے ؎

جنت کی ہے ہوس کبھی کہتے بتاں کی ہو مجھ کو خبر نہیں مری مٹی کہاں کی ہو

ایک غریب رانڈ کو بادشاہ سلامت کے ہاں سے ایک روپیہ مہینہ وظیفہ کا ملا کرتا تھا، وہ خواجہ نے موقوف کر دیا۔ اس بڑھیا کا بیٹا شہر کے شہدوں میں گنا جاتا تھا۔ ایکدن موقع پا کر دربار عام میں آگھسا اور ستون سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ بادشاہ سلامت نے سمجھ لیا کہ فریادی ہے۔ حکم ہوا کہ پوچھو کیا چاہتا ہے۔ شہدے نے کہا مہابلی کرامات میرے پاس ایک مرغی ہے۔ ہر مہینہ چاندی کا ایک انڈا دیتی تھی۔ مگر دو مہینے سے کڑک ہو گئی ہے۔ بادشاہ سلامت نے فرمایا دفتر شاہی میں پوچھ گچھ کرو، جب یہ راز کھلا تو بادشاہ سلامت سن کر مسکرائے اور بڑھیا کو روپیہ معمول سے ملنے لگا۔

شاہجہاں آباد میں ایکدفعہ ایسا امن چین (بھونچال) آیا کہ مخلوق ڈر کے

مارے تراہ تراہ کرنے لگی۔ طاقوں میں سوائے قرآنوں کے کوئی چیز نہ رہی! سب گر پڑیں اور امن چین کسی طرح رکنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا، کئی گھنٹے جب برابر در و دیوار لرزتے رہے تو شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے فرمایا "لوگو ہم سب اپنے گناہوں سے سچے دل سے توبہ کریں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم میں سے کوئی شخص گناہ پر اڑ گیا ہے، اس لئے بھونچال بھی اڑ گیا ہے، اگر وہ شخص اپنی بدی سے باز نہ آئے گا تو شہر غضب الٰہی سے اجڑ جائے گا۔ اور آٹے کے ساتھ گھن کی طرح پس جائے گا۔"

اس بات کو سن کر لال قلعہ کی ایک لونڈی نے کہا، بیس دن ہوا کہ ملکہ زمانی کی ایک ہیکل جواہر کی چوری گئی تھی جس کی تختیوں پر سارا قرآن کندہ ہوا تھا اور پھر اس کا پتہ نہ لگا۔ دراصل وہ ہیکل مجھ بندی نے اڑائی اور ایک منڈاس میں دبائی ہے۔ یہ اسی کی آفت ہے۔ میرے ساتھ دو چار آدمیوں کو بھیجا جائے تو میں نکلوا دوں جہاں پناہ کے ہونٹ ہلتے ہی بہت سے نوکر اور بادشاہ زادے دوڑے اسے کھود کر لائے۔ پہلے اسے نہروں پاک کیا، پھر کنوئیں کے پانی سے، کیوڑے سے گلاب سے دھویا، طرح طرح کی خوشبو اور عطروں میں بسایا، خیر خیرات ہزاروں کی ہوئی، تمام بادشاہزادیاں ہیکل پر سے قربان ہوئیں۔ بادشاہ سلامت نے اسے سر پر چڑھایا، آنکھوں سے لگایا۔ لونڈی عمر دار سے سجدہ کر دیا۔ امن چین جاتا رہا ہیکل کے نکلتے ہی وہ بلا دفع ہو گئی تھی۔

لال قلعہ کے بادشاہوں کے ہاں یہ آئین تھا کہ ایک استاد خوشنویس کے ہزار پانچ سو کم عمر غلام شاگرد کر دیے جاتے تھے، اور وہ مشق کرتے کرتے خوشنویسی میں کامل ہو جاتے تھے، اور سب کا خط ایسا ملتا جلتا ہوتا تھا کہ زید بکر کے لکھے میں کوئی فرق نہ معلوم ہوتا تھا جب حضور والا چاہتے تھے سو جُز کی کتاب کا شیرازہ توڑ کر سو غلاموں کو ایک ایک جُز بانٹ دیتے اور فرما دیتے تھے کہ ہر کاتب اپنا اپنا جُز غروب آفتاب سے پہلے لکھ کر پورا کرے۔ اور اس تدبیر سے سو جُز کی کتاب ایک دن میں لکھی جاتی تھی۔ پھر ساری کتاب ایک قلم ایک سیاہی کی، ایک کاتب کی لکھی معلوم ہوتی تھی۔ اسی طرح جدول کش۔ نقاش، مصور بھی ساتھ ساتھ سینکڑوں ہزاروں ہوتے تھے اور ایک ہی دن میں وہ بھی کتاب کو بنا سنوار کر دُلہن بنا دیتے تھے۔

جب ملکہ زینت محل کی مہربانی سے محبوب علی خاں خواجہ سرا ابوظفر بادشاہ کے وزیر ہوتے تو انہیں یہ دھیان آیا کہ میں اَن پڑھ ہوں اور وزارت کے لئے علم درکار ہے۔ کیونکر کام چلے گا۔ اُنکے ایک خیر خواہ نے خبر دی کہ تیلی واڑہ میں ایک استاد رہتے ہیں جو بادشاہزادوں اور امیروں کے بچوں کو ٹھیکہ لے کر فارسی لکھنا پڑھنا سکھاتے ہیں۔ جس رنگ کی انشاء کہیے اُسی رنگ شاگرد لکھنے لگتا ہے، ٹھیکہ کی دستاویز فائدہ کے ساتھ لکھوا لیتے ہیں۔ ٹھیکہ کا نصف روپیہ

پیشگی اور نصف روپیہ ٹھیکہ کی میعاد کے خاتمہ پر لیتے ہیں، اور اگر میعاد مقررہ میں
شاگرد نامراد رہے تو روپیہ جو پیشگی لیا ہے ہنسی خوشی واپس کر دیتے ہیں مگر اس
پچاس برس میں یہ شکایت ایک شاگرد نے بھی نہیں کی کہ میں تعلیم میں ہیٹا رہا۔ اور
استاد کو پیشگی رقم واپس کرنی پڑی ہو۔ ان کا نام مولوی امام علی صاحب ہے شاہجہاں
آباد کی فصیل سے باہر تیلی واڑہ میں رہتے ہیں۔ محبوب علی خاں یہ بات سن کر
بہت خوش ہوئے اور بادشاہی سوار بھیجکر مولوی صاحب کو لال قلعہ میں بلوایا اور
بہت تعظیم سے بٹھایا اور اپنا مدعا سنایا۔ مولوی صاحب نے فرمایا پانچہزار روپیہ
لوں گا، ایک برس میں آپ اتنے قابل ہو جائیں گے کہ فارسی عبارت منشی عنایت اللہ
کی بہاردانش جیسی لکھنے لگیں گے۔ اور وزارت کے تحریری کام میں کسیطرح بند نہ
ہونگے۔ بعد رد و کد تمسک گواہی شاہدی سے لکھا گیا۔ اور ڈھائی ہزار روپیہ نقد
پیشگی وزیر صاحب نے مولوی صاحب کو دیدئے۔ مولانا کیواسطے مقررہ وقت
پر سواری جاتی، مولانا لال قلعہ میں تشریف لے جاتے، ایک گھنٹہ شاگرد کو لکھواتے
پڑھواتے اور چلے جاتے۔ مولانا نے محبوب علی خاں کو ایک قلمی انشا بھی اپنی تصنیف
سے دے رکھی تھی۔ جس سے بہت نکتے حل ہوتے تھے۔ ایک سال پورے چھ مہینے
گذر رہے تھے جو محبوب علی خاں قابل ہو گئے برس دن پورا ہوا تو مولوی صاحب نے
اپنے باقی روپیہ کا تقاضہ کیا۔ شاگرد صاحب روپیہ کا نام سن کر بگڑ گئے اور انہوں
نے کہا استاد مجھے فارسی داری کچھ نہیں آئی۔ پیشگی جو ڈھائی ہزار آپ نے لئے ہیں

وہ بھی واپس دیجیے۔ مولانا جانتے تھے کہ "اصل بد از خطا خطا نہ کند" سال بھر کے
مسودے شاگرد کے ہاتھ کے ان کے پاس محفوظ تھے۔ ان کے ذریعے سے شاگرد
پر انگریزی عدالت میں ڈھائی ہزار کی نالش کر دی۔ مقدمے نے طول کھینچا۔ شاگرد
برابر انکار کرتے رہے اور کہتے رہے کہ مولوی امام علی صاحب کی تعلیم سے مجھے
کچھ حاصل نہیں ہوا۔ عدالت نے مجبور ہو کر مرزا نوشہ غالب، مفتی صدرالدین
صاحب آزردہ، مولوی امام بخش صاحب صہبائی، منشی نراتن داس صاحب
پٹواری کو جو فارسی کے خاقانی اور انوری تھے اپنی طرف سے پنچ بنایا اور مدعی اور
مدعا علیہ کو ناچار کیا کہ جو کچھ پنچ کہیں گے، اس فیصلہ کو تمہیں منظور کرنا پڑے گا۔
اور پنچوں نے بعد غور اور چھان بین کے لکھ دیا کہ مولوی امام علی صاحب کو
مدعا علیہ سے ڈھائی ہزار روپیہ دلوا دیا جائے۔ مدعا علیہ ضرور منشی عنایت اللہ
کے رنگ کی عبارت فارسی لکھتا ہے اور استاد کا کمال بے شک اس شاگرد میں
اثر کر گیا ہے، اور چنانچہ عدالت انگریزی نے ڈھائی ہزار روپے محبوب علی خاں سے
مولوی صاحب کو دلوا دیے، مگر اس نے دغا بازی سے مولوی صاحب کی انشاء
مار لی، کیونکہ نہ مولوی صاحب نے اپنے دعوی میں اسے شامل کیا تھا، نہ زبانی تذکرہ
اس کا آیا تھا۔ جب مولوی صاحب نے کتاب منگوائی تو شاگرد نے کہلا بھیجا کہ محض
آپ کی دل آزاری کے لیے کتاب نہ دوں گا۔ ورنہ وہ انشا بے حقیقت ہے، مولوی
صاحب نے فرمایا اس لنس کٹے سے کہہ دینا۔ ـــہ

کمینہ خداوند ہستی مباد　　　جواں مرد را تنگدستی مباد

تو کتاب نہ دے مگر انشاء اللہ میری دل آزاری کرنے کے وسیلے ایمان سلامت
نہ لے جائے گا۔ آخر وزیر صاحب مرضِ استسقا میں مبتلا ہوئے اور سمجھے صاحبِ
کتاب کی بددعا کا اثر ہے۔ زچ ہو کر کتاب مولوی صاحب کی خدمت میں بھیج دی
اور معافی چاہی، مولانا نے جواب میں کہلا بھیجا مردوں کا وار خالی نہیں جاتا۔
میرا تیر ہدف پر پہنچ گیا ہے ؎

تو مشو مغرور بر حلمِ خدا　　　دیر گیرد سخت گیرد مر ترا

؎ غدر کی مصیبت میں مرزا کالے صاحب جو بادشاہ سلامت کے پوتے تھے
لال قلعہ سے ستار ہاتھ میں لے کر اور بھیس بدل کر نکل کھڑے ہوئے اور جدھر کو
منہ اٹھا چل دیئے، چلتے چلتے بہت دور ایک والئ ملک کے ہاں پہنچ گئے۔ کسی نے کہا
جوگی ہیں کسی نے کہا رسول شاہی فقیر ہیں۔ مگر جو کچھ ہیں ستار کے فن میں کامل
ہیں۔ والئ ملک کے کان تک بھی اُن کی اُستادی کی خبر پہنچی تو اُس نے تخلیہ میں
بُلا کر انہیں سُنا، اور اُن کے ہاتھ کی رنگینی دیکھ کر حیران ہو گیا، پوچھا "شاہ
صاحب آپ کس دیس کے رہنے والے اور یہ جوگیا بستر کیسا ہے؟" شاہ جی نے
کہا، "داتا آپ سے کچھ پردہ نہیں، ہم دلّی کی راجدھانی کے رہنے والے ہیں۔ پرماتما
نے اس بھرے ٹھاٹھ کو سنپورن بگاڑ دیا۔ تو ہم بھی نکل کھڑے ہوئے۔ اپنا مت یہی ہے کہ

ستے اللہ شور ہے"۔ والیٔ ملک ضلع جگت کے بول سن کر بہت خوش ہوا۔ اور انہیں نوکر رکھ لیا کیونکہ سچ ہے:

قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری

خود بین بجاتا تھا۔ اور بڑے بڑے تنت کار اُس کے سامنے کان پکڑتے تھے۔ مرزا صاحب کو والیٔ ملک کے در دولت پہ رہتے رہتے برسوں دن ہو گیا۔ والیٔ ملک کی سالگرہ کا وقت آیا۔ رات کے وقت عیش و نشاط کی محفل سجائی گئی۔ والیٔ ملک راجہ اندر بن کر سنگھاسن پر براجمان ہوئے۔ گانے بجانے والے سب طرح کے اہل ہنر اپنا کمال دکھا رہے تھے، انعام پا رہے تھے۔ میاں امرت سین جی ستار نواز اور بہرام خاں جی کہ یہ جو اپنے وقت کے نایک تھے، سبھا میں بیٹھے تھے جو مرزا کلے صاحب کی نوبت آئی۔ مرزا صاحب نے ستار ہاتھ میں لیا۔ امرت سین جی نے کہا یہ جوڑ اور گت آپ کے گھر لے کی طرز ہے۔ یہ کہہ کر جو آپ نے ستار بجایا ہے تو جاننے والوں نے کہا کیا کہنا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسیت خاں جی اپنا کرتب دکھا رہے ہیں۔ پھر مرزا صاحب نے امرت سین جی کو مخاطب کر کے یہ کہا یہ بہت استاد میر ناصر احمد صاحب ہی کا رنگ ہے۔ اتنا فرما کر ایک ایسا جو کھینچی تو ساری سبھا ایک تنہ ہو کر داد دی اور کہا واہ وا۔ اور بہرام خاں نے کہا صاحب عالم آپ کی اس تان کی تعریف ہو نہیں سکتی۔ اگر آپ لال قلعہ میں پیدا نہ ہوتے اور لال پردہ کی آڑ میں اس کام پر لاکھوں روپیہ خرچ نہ کرتے تو یہ گُر کہاں ملتا

اور راگ میں ڈھلی ہوئی کبھی آپ کی انگلیوں سے نہ نکلتی!"

والی ملک نے بہرام خاں سے کہا "صاحب عالم کون اور لال قلعہ اور لال پردہ کیسا ہے؟" بہرام خاں نے اپنا ہاتھ اپنے ماتھے پر مار کر کہا "ان داتا یہ گبرو جوان تو سلے اور گبرو دکھڑے پہنے آپ کو ستار سنا رہا ہے۔ یہ دلی کا بادشاہ زادہ اور بہادر شاہ ابو ظفر کا قریبی رشتہ دار ہے، مرزا کالے انکا لاڈلا نام ہے۔ میں نے انہیں بادشاہ سلامت کے پہلو میں مسند پر بیٹھا دیکھا تھا۔ لاکھوں روپے خرچ کر کے اس ہنر کو انہوں نے استادوں سے سیکھا تھا۔ دن رات لال پردہ میں بیٹھے اسی کام کو کیا کرتے تھے" بہرام خاں کی اس گفتگو نے اہل محفل کے دل ہلا دیئے، دیر تک سناٹا رہا۔ والی ملک نے خود اٹھ کر بادشاہزادے کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور مرزا صاحب سے ملکر خوب رویا اور اپنی مسند پر بٹھا کر کہا۔ "یہ آپکے بڑوں کی بخشی ہوئی گدی ہے۔"

اب مجھے یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ بہرام خاں کون شخص تھا۔ دراصل یہ قوم کا گویّہ تھا۔ کوٹھ پنجاب کا باشندہ تھا۔ علم موسیقی یعنی راگ ریت کے گانے بجانے کا اس صدی میں امام گذرا ہے جسے ہندی میں نایک کہتے ہیں۔ ایک راجہ کا نوکر تھا اُسے گانا سنا کر خوش کیا کرتا تھا۔ راجہ بین کا رکھتا اور بین خوب بجاتا تھا۔ اور جاننے والے جانتے ہیں کہ بین کا ریٹری مشکل سے بنتا ہے۔ ایکدن راجہ اپنی بین کی تعریف کرنے لگا۔ بہرام خاں اس تعریف کو سن کر تبسم ہو گیا۔ کہنے لگا "راجہ

صاحب آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ بین کس لئے بنائی گئی اور کس نے بنائی ہے؟"
راجہ:" استاد آپ ہی جانتے ہو نگے کہ بین کیوں بنائی گئی اور کس نے بنائی ہے"
بہرام خاں:" سُن! بادشاہوں کی محفل میں گویئے گاتے تھے تو انہیں تھوکنے کی اجازت نہ تھی اور اگالدان نہ ملتا تھا اور گانے میں گویئے کو تھوک بہت آتا ہے اس لئے گویئے کی جان پر بن جاتی تھی اور دربار میں گانا دوبھر ہو جاتا تھا، ناچار عقلمند لوگوں نے یہ بین بنائی اور دو تو نبیاں اس میں کھلے منہ کی ایسی لگائیں جو اگالدان کا کام دیں۔ اور محفل میں جو لوگ بین کار کے روبرو ہوں انہیں تھوکنے کی خبر نہ ہو، بین ذلیل چیز ہے، اور میں تین دن میں کتوں کو بین سکھا دیتا ہوں"

راجہ بہرام خاں کی ان باتوں کو سُن کر مارے غصہ کے تھرا اٹھا اور اس نے کہا" مجھے یہ تماشہ ضرور دکھایئے کہ آپ تین دن میں کتوں کو بین کیونکر سکھا دیتے ہیں؟"
بہرام خاں:" راجہ صاحب! بیشک اگر میں یہ تماشا آپ کو نہ دکھاؤں تو سزا بھی میرے لئے یہی ہوگی کہ میرا سر کٹوا لیا جائے، شاستر میں لکھا ہے اور میں نے پڑھ لیا ہے کہ مورکھ آدمی بیل اور گدھے اور کتے سے بدتر ہے، اس واسطے آپ ایک ایسا آدمی جو مورکھ پن میں ڈھور جیسا ہو اور ایک چکارہ جیسا بتیوں

اور گنہگاروں کے سجانے کا ذلیل ساز ہے منگوا دیجئے اور مجھے اور اس معرکہ آدمی اور چکارہ کو ایک پہرہ کے مکان میں پہونچا دیجئے اور تین دن کے کھانے پینے کا بندوبست بھی کر دیجئے۔ بعد تین دن کے جلاد کو بھی دربار میں بلا لیجئے اور ہم استاد شاگردوں کو بھی طلب فرمائیے۔ اگر میرا دعویٰ غلط ہو تو جلاد سے میرا سر کٹوا دیجئے"

اتفاق کی بات راجہ صاحب کے حویلی میں ایک سائیس ہی ایسا مل گیا جو بالکل احمق تھا، اور وہ بہرام خاں کی شاگردی کے لئے تیار بھی ہو گیا۔ چنانچہ خاں صاحب اور سائیس تین دن رات پہرے میں رکھے گئے اور چوتھے روز جو نکالے گئے اور امتحان لیا گیا تو معلوم ہوا کہ بہرام خاں نے شاگرد کو یہ فن گھول کر پلا دیا ہے ذوقؔ نے اسی موقع کے لئے قصیدہ میں کہا تھا ؎

اہلِ موسیقی ایسا کہ ادا کرتا تھا کبھی میں بارہ مقام اور کبھی چار ملت

جس راگ یا راگنی کی فرمائش کی جاتی تھی سائیس چکارہ میں بجاتا تھا۔ اور استادی کے ساتھ بجاتا تھا اس کرشمہ کو دیکھ کر راجہ نے بہرام خاں سے معافی مانگی اور کہا کہ "آپ میرے نزدیک نایک کیا کرشن کنہیا ہیں!"

بہرام خاں اپنے ہنر کی وجہ سے بڑا مغرور آدمی تھا، بڑے بڑے راجہ نواب اُسے اپنے پاس رکھتے تھے اور قدر کرتے تھے مگر بہرام خاں ذرا سی بات پر بگڑ کر چل دیتا تھا۔ ایک دن ایک راجہ کے ساتھ ہاتھی پر سوار شہر میں جا رہا تھا۔ اتفاقاً ایک گویّا بغل میں بستہ دبائے ہاتھی کے سامنے آ گیا۔ راجہ نے مسکرا کر کہا۔

"بہرام خاں دیکھیے آپ کا بھائی سنتا رہ چلا جاتا ہے۔" خاں صاحب نے ان سنی
کر دی، چند روز کے بعد راجہ صاحب شکار کو نکلے، بہرام خاں خواصی میں راجہ
کے ہاتھی پر بیٹھے تھے، چلتے چلتے راجہ صاحب ایک جنگل میں پہونچے اور ساتھی دور
رہ گئے، پانی پینے کے واسطے راجہ صاحب نے اپنا ہاتھی رکوایا، جہاں راجہ کا ہاتھی
ٹھیرا تھا، وہاں ایک ہل والا ہل جوت رہا تھا، راجہ صاحب کو دیکھ کر ہل والا
راجہ صاحب کے سلام کیواسطے ہاتھی کے پاس آیا اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا
بہرام خاں نے اُس سے پوچھا "تم کون قوم ہو؟" ہل والے نے کہا "راجپوت"
بہرام خاں نے پوچھا "کس بنس کس گوت کے راجپوت ہو؟" اتفاق سے ہل والے
نے وہی بنس وہی گوت بتایا جس میں راجہ صاحب تھے۔ بہرام خاں نے کہا
"مہاراج تقدیر دیکھیے یہ آپ کا بھائی ہے ہل جوتتا ہے اور آپ ہاتھی پر سوار رہتے
ہیں۔" راجہ صاحب اس جواب کو سن کر دم بخود ہو گئے، اور بہرام خاں ہاتھی کی دم
پکڑ کر کھسل پڑے اور چل دیئے کیونکہ جانتے تھے، میں نے آقا کے ساتھ دریدہ دہنی
کی ہے۔ گھر بیچ کر بندی خانہ بھجوا دیگا۔ ضلع بلند شہر میں ایک چھوٹی سی ریاست
ہے، پنڈراول وہاں کے رئیس کا نام راجہ باقر علی خاں صاحب تھا۔ بہرام خاں
اُن سے بہت مانوس تھا، اور پنڈراول میں پڑا رہتا تھا۔ بہرام خاں خوش
آواز نہ تھا۔

ایک دن میں رخصت لے کر لال قلعہ سے بارہ دری آئی۔ کیونکہ اعلیحضرت خواجہ محمد ناصر صاحب کا عرس تھا۔ رات تک پانچوں حویلیاں عورتوں سے کھچا کھچ بھر گئیں۔ صحن میں چاندنی کا فرش تھا، بی آمانی بیگم کا سجادہ سجاتے غالیچے بچھا ہوا تھا۔ سبز فانوسوں میں شمعیں روشن تھیں اور روشنی سے رات کا دن ہو گیا تھا۔ ایک بیوی نیازی بیگم نام جو پیٹ سے تھیں، ایک فانوس ناظرادے کے پاس سے گذریں۔ کریب کا دوپٹہ سر پر تھا، اس کے آنچل میں آگ لگی اور چوٹی تک پہنچ گئی۔ انگیا، کرتی، تہ پوشی میں سرایت کر گئی، عورتیں بجھاتی تھیں، شور و غل سنکر حضرت کے گھرانے کے مرد اور لڑکے زنانہ میں پہنچ گئے اور انہوں نے آگ بجھانے میں مدد کی۔ مگر آگ ایسی ظالم تھی کہ جب تک اس نے گلے کی چمپا کلی اور بازوؤں کے جوشن نونگوں کا ڈورا نہیں جلا لیا، نہیں بجھی۔ ایک عورت نے ہاتھوں کی لاکھ کی چوڑیاں توڑ کر پھینکدی تھیں، نہیں غضب ہو جاتا، گہنا زیور جل کر پنڈہ میں بیٹھ گیا جو مشکل سے جدا کیا گیا۔ بکسے کا شکران کا خون چلے پھڈالا گیا۔ کیونکہ آگ کے جل جانے کا یہ بھی علاج ہے۔ حضرت صاحب نے باہر سے کہلا بھیجا کہ "بیٹی والی عورت کا دودھ آبلوں پر ڈالا جاتا ہے"۔ خدا کی قدرت اور حضرت صاحب کے مزار کی برکت سے عرس میں بیٹی والی عورتیں سینکڑوں ہی آئی تھیں۔ انہوں نے بے دریغ اپنا دودھ نیازی بیگم پر ڈالنا شروع کیا اور اتنا ڈالا کہ وہ دودھ میں سر سے پاؤں تک نہا گئیں۔ اور دودھ کی ٹھنڈک انہیں ایسی پہنچی کہ ایسا لگتا تھا سردی

سکے مارے ان کا دانت سے دانت بجنے لگا۔ اور انہوں نے کہا "آپ دودھ نہ ڈالو نہیں مارے سردی کے اس بندی کا دم نکل جائیگا"۔ جس پلنگ پر نیازی بیگم پڑی تھیں اس پر سے دودھ ٹپک کر زمین پر پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ ان کے شوہر نے چاہا کہ انہیں گھر لے جائیں، مگر حضرت صاحب اور زنانی بیگم صاحب نے فرمایا "نیازی بیگم کا یہ پیر خانہ ہے اور پیر دستگیر ہوتے ہیں۔ ہمارا دل گوارا نہیں کرتا ہے کہ یہ اس حالت میں ہمارے ہاں سے جائیں۔ انشاء اللہ الناصر یہ غسلِ صحت کر کے اپنے گھر جائیں گی۔ اور ہمارے ہاں آگ کے جلے ہوئے کا ایک مرہم ہے جو دو دن میں ہی زخموں کو اچھا کر دیتا ہے۔ وہ تیار ہو رہا ہے۔ کل سے لگایا جانے لگا۔ اور چند روز میں نیازی بیگم نہا دھو پلنگ کو لات مار اپنے گھر سدھاریں گی"۔

کون نہیں جانتا کہ حضرت شاہ نصیر صاحب دہلوی، اکبر ثانی اور ابو ظفر بہادر شاہ اور شیخ ابراہیم ذوق کے استاد تھے۔ جب شاہ نصیر صاحب کا اور ذوق کا دل کھٹا ہو گیا اور اصلاح موقوف ہوئی تو ذوق ہر جمعہ کو مولانا عبدالعزیز کے وعظ میں جانے لگے اور وعظ بہت غور سے سننے لگے۔ کسی دوست نے اس کا سبب پوچھا تو ذوق نے کہا "استاد مجھ کمبخت سے ناخوش ہو گئے۔ شعر و سخن میں اصلاح ملتی نہیں، اس کا بدل میں نے یہ نکالا ہے۔ کیونکہ مولانا عبدالعزیز صاحب اردو زبان دانی میں شاہ نصیر صاحب سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ ان کے بیان اور گفتگو

کو سُنتا ہوں اور اُردو کے محاورے روزمرّہ یاد کرتا ہوں، اس لئے کہ شاہ عبدالعزیز
صاحب اپنے والد ماجد کے حکم کے بموجب اُردو زبان سیکھنے کے لئے خواجہ میر دردؔ
صاحب رحؒ کی خدمت میں بچپن سے حاضر ہوتے تھے اور چپ چاپ بیٹھے ہوئے
آپ کی تقریر کو سُنا کرتے تھے اور محاورات کو دل ہی دل میں چُنا کرتے تھے۔
مولانا ولی اللہ صاحب اپنے بچّوں سے کہا کرتے تھے جس طرح اصول حدیث اور
اصول فقہ فن ہے، اسی طرح اصول زبان بھی فن ہے۔ اور اُردو زبان کے موجد
اور مجتہد خواجہ میر دردؔ صاحب رحؒ ہیں، آپ کی صحبت کو اس فن کے واسطے غنیمت
سمجھو کیونکہ خواجہ صاحب بچّے بان ہیں۔ چنانچہ شاہ عبدالقادر صاحب خاص
طور پر میر دردؔ صاحبؒ کے شاگرد تھے۔ تو شاہ نصیر صاحب کا تذکرہ تھا۔ شاہ
صاحب جیسے باکمال تھے ویسے ہی کم رُو تھے۔ ایک دن پلٹن کے چار سپاہی روشن
پورہ میں، جہاں شاہ نصیر صاحبؒ رہتے تھے، کہتے ہوئے آئے کہ ہمارے صوبیدار
صاحب ہندوستانی کپڑے سلوائیں گے، ایک درزی کی ضرورت ہے۔ اگر اس
محلّہ میں کوئی درزی رہتا ہو تو بتادو کپڑے سی آئے۔ مُنہ مانگی سلائی لے آئے۔
گلی کے نکّڑ پر چند اوباش بیٹھے تھے، اُنہوں نے کہا دیکھو یہ سامنے والا جو
مکان ہے اس میں ایک درزی رہتا ہے جو بڑا کاریگر ہے، اُسے شاہ صاحب
کہہ کر پکارنا اور جب وہ دروازے پر آئے تو اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہو کپڑا سینے
چلو، وہ کہے گا میں درزی نہیں ہوں مگر تم یقین نہ کرنا اور اپنے ساتھ پکڑ کر لے جانا

اور جو کچھ سلوانا ہو سلوا لینا۔ چنانچہ شاہ نصیر صاحب حویلی سے نکل کر باہر آئے
تو اُن کی صورت پر درزی پن برستا تھا، کیونکہ ظاہری شان سے خدا نے حضرت
کو محروم کر دیا تھا۔ ہر چند اُنھوں نے کہا میں درزی نہیں ہوں، مگر سپاہیوں
کو محلے کے بدمعاش پہلے سبق دے چکے تھے، وہ کب مانتے تھے۔ دو کوس
پیدل چل کر بیچارہ پیر اُنھیں لے پہنچے، صوبیدار صاحب نے اُنھیں اپنے ڈیرے
میں بٹھایا اور تین شکوہ کا ایک تھان منگا کر اُن کے سامنے ڈال دیا۔ شاہ
صاحب نے تین شکوہ کے تھان کو اُلٹ پلٹ کر کہا۔ "کفن تو سی ہی دوں گا مگر
میت کا ڈیل ڈول اور قد و قامت تو بتا دیجیے جس کے اندازے کفنی، لپیٹ کی چادر
و اور پھاڑوں۔"

صوبیدار نے کہا۔ "ہم نے تو تمہیں انگرکھا سلوانے کے لیے بلایا ہے۔"

شاہ صاحب: "میں تو کفن دوز درزی ہوں۔"

صوبیدار: "آپ نے ہمارے آدمیوں کو بتایا نہیں تھا؟"

شاہ صاحب: "میں نے بہت کچھ سمجھایا اور بتایا تو تھا مگر وہ ٹھیٹ پوربیے گنوار
ہیں، دلی کی بولی اُن کی سمجھ میں نہ آئی اور مجھے زبردستی پکڑ لائے۔"

صوبیدار: "توبہ الٰہی ان سپاہیوں نے صبح ہی صبح کیا بدشگونی کروائی ہے۔
میاں صاحب خدا کے لیے آپ یہ سواری لیجیے اور گھڑی کی چوتھائی میں اپنے
گھر سدھاریے۔ اور کبھی خدا ایسا موقع نہ لائے کہ آپ ہماری پلٹن میں آئیں۔"

جب شاہ صاحب نے یہ لطیفہ بادشاہ کو سنایا تو بادشاہ ہنسی کے مارے لوٹ گئے اور فرمایا "واہ اُستاد آپ نے یہاں بھی نازک خیالی کو نہ چھوڑا اور اپنے تئیں کفن دوز کہہ کر پیچھا چھڑایا ورنہ سپاہی اور صوبیدار آپ کو بہت پریشان کرتے کیونکہ یہ لوگ نرے اُوجبٹا ہوتے ہیں۔"

میرا قاعدہ تھا کہ میں ایک مہینے میں لال قلعے سے بارہ دری کے دو پھیرے کیا کرتی تھی۔ ایک دوسری کو ایک چوبیسویں کو۔ ان تاریخوں کے اندر خواجہ میر درد صاحب کے وقت سے راگ کی دو محفلیں ہوتی تھیں اور اس دھوم دھام سے ہوتی تھیں کہ لال قلعہ کے بادشاہ اور بادشاہزادے پسند کرتے تھے۔ جب میں جہاں پناہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو جاتی تو حضور والا فرماتے "ہم سمجھ گئے۔ آج چاند کی دوسری یا چوبیسویں ہے، بارہ دری جانے کی چھٹی چاہتی ہو، اچھا جاؤ۔ یہ خواجہ صاحب کے ہاں کی بڑی پُر برکت محفلیں ہیں، محمد شاہ پیا اور شاہ عالم ثانی اور اکبر ثانی اور ولی عہدی تک میں بھی اُن میں شریک ہوا ہوں۔" جب میں پلٹ کر لال قلعہ میں آتی تو حضور کو آداب بجا لاتی۔ حضور فرماتے "کہو خانم اس تاریخ میں محفل کیسی رہی کونسی کنچنی اچھا گائی، کس گوئیے نے خواجہ محمد نصیر سے زیادہ داد لی۔"

جو کچھ حال مجھے معلوم ہوتا وہ میں عرض کر دیتی۔ کیونکہ میں پردہ نشین تھی۔

محلسرا میں رہتی تھی محفل کا حال کم معلوم ہوتا تھا۔ ایک بار حضور والا کے پوچھنے لگے بیگم نے کہا کہ اب کی محفل میں یہ لطیفہ ہوا کہ حضرت صاحب کے سامنے میر ناصر احمد صاحب بین بجا رہے تھے اور مٹھو پکھاوجی پکھاوج سے سنگت کر رہا تھا اور ایک کولی ننگے گلے ننگے سر صرف ایک میلی سی دھوتی جو رانوں تک نہ آتی تھی، باندھے لب فرش جوتیوں پر بیٹھا تھا۔ لوگوں کو اس کا جوتیوں پر بیٹھنا بھی ناگوار تھا اور چاہتے تھے کہ یہ یہاں سے بھی چلا جائے مگر حضرت صاحب کے ادب سے کوئی اُف نہ کر سکتا تھا اور وہ بار بار حضرت صاحب کی طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑتا تھا اور دانت نکال دیتا تھا۔ جب وہ کولی یہ حرکت کئے ہی گیا تو حضرت صاحب نے تسبیح ہاتھ سے رکھ کر اشارہ کیا کہ تم کیا چاہتے ہو، کولی نے چلا کر کہا مٹھو جی سے دو گھڑی کے لئے پکھاوج مجھے دلوا دی جائے۔ حضرت صاحب نے مٹھو کی طرف اشارہ کیا کہ پکھاوج اسے دیدو۔ مٹھو کو یہ بات بہت شاق گذری مگر حضرت کے ڈر سے دم نہ مارا اور کہا لو پکھاوج۔ کولی دوڑا اور پکھاوج لے کر مٹھو کے پاس بیٹھ گیا اور اس خوبی سے پکھاوج بجانی شروع کی کہ میاں مٹھو اور میر ناصر احمد صاحب کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے کئی تالیں متروک بجا کر سنائیں اور بے اختیار حضرت صاحب نے داد دی۔ میر ناصر احمد صاحب نے امتحان کے لئے اس سے کہا "اچھا میری بین کے ساتھ پکھاوج بجاؤ۔" اور اس نے بین کا اس لطف سے ساتھ دیا کہ محفل میں سناٹا چھا گیا۔ میر صاحب نے ہر چند چاہا کہ غریب کولی کو غلط کریں اور

وہ تال ہم سے الگ ہو جانے سے تر وہ کا ال تھا۔ وہ میر صاحب کے دھوکے میں نہ آیا۔ آخر میر صاحب نے اپنا ہاتھ سے رکھ دی اور کہا "واہ چودھری تیرا کیا کہنا ہے" حضرت صاحب نے پانچ روپے اُسے انعام دیئے۔ بادشاہ سلامت نے یہ لطیفہ سُن کر فرمایا ؎

خاکساران جہاں را بحقارت منگر — تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

غدر ۱۸۵۷ء میں عید

رہے گا کوئی تو تیغ ستم کے یادگاروں میں — مرے لاشے کے ٹکڑے دفن کرنا سو مزاروں میں

اہل اللہ کی عید کا ہم ذکر کرنا نہیں چاہتے کیونکہ اُن کی ہر عید سبحان اللہ اور صلِ علیٰ، رونا دُنیا پرستوں کی عید کا ہے کہ اچھی بھی بُری ہوتی ہے۔ اور بُری کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ آپ ظاہر پرست ہیں میٹھی عید اور سلونی کی تیاری کو دیکھ کر مگن ہو جاتے ہیں آپ کو یہ دھیان نہیں آتا کہ کتنے اللہ کے بندے بندی خانہ میں سیلے پر پڑے سسکتے ہیں۔ قید خانہ کے تنگ مکانوں میں عید کی کوئی علامت پائی نہیں جاتی اس خیال میں کہ ؎

بلبل ہوں صحن باغ سے دُور اور شکستہ پر — پروانہ ہوں چراغ سے دُور اور شکستہ پر

آج میری بیوی میرے بال بچے میرے ماں باپ کس طرح میری جدائی میں بیقرار ہونگے گھر میں عید منانے کا کوئی سامان نہ ہوگا۔ پڑوس کے بچوں کے نئے

کپڑوں کو اور اپنے میلے کچیلے کپڑوں کو دیکھکر میری اولاد کیسی کھسیانی ہوگی اور کس حسرت سے لوگوں کا منہ تکتی ہوگی آپ فقیر نہیں اور تفکر الساعتہ خیر من عبادۃ سبعین سنتہ کا راز آپ نے معلوم نہیں کیا ورنہ آپ ضرور فکر کرتے کہ شہاب الدین شاہجہاں صاحبقران ثانی شہنشاہ ہندوستان جس کی قلمرو کابل و کشمیر تک تھی جس نے تخت طاؤسی بنایا تھا جس نے دلی کا لال قلعہ سجایا تھا جس نے دس سال تک دس جشن ایسے منائے جس کی رونق کے آگے آسمان پر چاند سورج کی محفل آرائی ہیچ ہوگئی تھی جب اُسے اورنگ زیب نے اکبر آباد میں جسے میں حسرت آباد کہتا ہوں قید کردیا تو اُس نے اکبر آباد کے بندی خانے میں کتنی برس کاٹے اور اُسے موتی مسجد کے حجرے میں کتنی عیدیں آئیں اور ہر عید کو اپنا جاہ و حشم یاد کرکے اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے ساتھ جگر اور دل کا لخت لخت خون ٹپک جاتا تھا۔ باپ کو روتا دیکھکر لائق اور سعادت مند بیٹی جہاں آرا بیگم کی روتے روتے ہچکی بندھ جاتی تھی اور اشک خونیں کی روانی سے مخمور نرگس گل زرد بن جاتی تھی مگر وہاں ان دونوں کا ہمدرد اور سمجھانے والا نہ تھا جو کہتا ؎

زرنج و راحت گیتی مرنجان دل مشو خرم
کہ احوال جہاں گاہے چنیں گاہے چناں باشد

آپ نے عید کے دن جامع مسجد دہلی میں یہ کبھی بار ہا دیکھا ہوگا کہ حوض کے

پاس ایک دو جنازے بھی رکھے ہیں۔ خیال کیجئے کہ جن گھروں سے یہ جنازے نماز کے لئے لائے گئے ہیں اُن گھروں میں عید کا کیا مزہ ہوگا اور ان میں کیونکر عید منائی گئی ہوگی۔ اس رنگ کی عید کے متعلق کہاوتیں اور مثلیں بھی چلی آتی ہیں۔ یعنی ایک لونڈی آ کر کہتی ہے "بیوی بیوی عید آئی" بیوی فرماتی ہیں چل مُردار دُور ہو تجھے اپنی روٹی ٹکیا سے غرض ہے تجھے عید سے کیا واسطہ" دوسری لونڈی آتی ہے اور کہتی ہے "بیوی بیوی عید آئی" بیوی بولیں "تجھے اپنا آگے کا گریبان پیچھے اور پیچھے کا آگے کرلے" آپ نے اس کا بھی تجربہ کیا ہوگا کہ رتھوں میں، منجھولیوں میں، تانگوں میں، بہلیوں میں، یکوں میں موٹر کاروں میں، ریل میں مسلمان مسافر عین عید کے دن سوار چلے جاتے ہیں۔ اگر یہ اللہ کے بندے حاجت میں جکڑے نہ ہوتے تو کیوں اُنہوں نے گھر رہ کر تہوار نہ منایا ایسی پُردرد عید کی مثالیں ہزاروں ہیں۔ مگر میں اسی قسم کی بپھری وقت کی عید کا ایک سماں دکھاتا ہوں جو ہماری دلی اور لال قلعہ کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہے یعنی رمضان ۱۲۷۱ھ کی شام ہوئی ہے، ۱۱ مئی ۱۸۵۵ء سے مطابق ہے لال قلعہ میں حضرت ابوظفر بہادر شاہ اور انکی آل اولاد مگن ہے شہر دہلی سرکار کمپنی کے ٹھیکے میں سکھ کی نیند سو رہا تھا۔ شہر میں ٹھیاقلس مٹکاف صاحب مجسٹریٹ مسٹر ہچنسن کلکٹر اور سمن فریزر صاحب کمشنر ہیں، صبح کا وقت ہے، عدالت اور کچہریاں اسی ٹھنڈے زمانے میں گرم ہوتی ہیں، ٹھیا محل کی سڑک پر بڑی حویلی کے سربلند

دروازے سے کہ آ گئے مفتی صدرالدین صاحب صدر الصدور کی فٹن تیار کھڑی ہے،
یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سوائے صدر الصدور کی دولت سرا کے شہر
بھر میں فٹن گاڑی نہیں ہے۔ کیونکہ اس وقت فٹن عنقا سمجھی جاتی ہے۔ صدر
الصدور صاحب چونکہ فرنگیوں کے نوکر ہیں اس لئے یہ انوکھی چیز آپ کے پاس
ہے۔ اس گاڑی میں دو گھوڑیاں جُتی ہوئی ہیں۔ یکایک مفتی صاحب دیوان
خانے سے باہر تشریف لائے اور فٹن میں سوار ہو گئے۔ سامنے کی بیٹھک پر
آپ کا پیشکار بیٹھ گیا۔ اور اُس نے کوچبان سے کہا کشمیری دروازہ میں ہو کر کچہری
کو چلو۔ اتنا کہتے ہی فٹن چلدی۔ صبح کا سہانا وقت مُردہ دلوں میں بھی اُمنگ پیدا کرتا
ہے۔ گھوڑیاں فراٹے بھرتی اٹکھیلیاں کرتی چلی جاتی ہیں جو سامنے کشمیری دروازہ
آ گیا۔ کوچبان نے گھوڑیوں کی رفتار کو تھوڑا سا دھیما کیا۔ دروازہ کے برابر کیطرف
ایک سپاہی اونچی بنا ہوا بندوق میں سنگین لگائے پہرہ پر کھڑا تھا۔ یہ قوم کا
پوربیہ تھا اس لئے اُس کا رنگ کالا اور قد بہت لانبا تھا۔ اس سنتری نے مفتی
صاحب کو انگریزی قواعد کے موافق بندوق اور سنگین سے سلامی دی اور چند
ہی منٹ میں مفتی صاحب اپنی کچہری میں پہونچ گئے۔ آپ کے کمرے میں دری
چاندنی قالین کا فرش تھا۔ گاؤ تکیہ سے لگ کر بیٹھ گئے دو رویہ وکیل مختار مدعی
مدعا علیہ جانفی بیٹھا ضر ہوتے اور عدالت گرم ہوئی اور کام کرتے کرتے
اندازاً کوئی دس بجے ہونگے جو زمین کو زلزلہ ہوا اور زلزلہ کے ساتھ ہی ایک ایسی

سخت آواز کانوں تک پہونچی کہ معاذ اللہ گمان تھا کہ انسانوں کے پتے پھٹ جائیں گے اور جانیں فنا ہو جائیں گی۔ کچہری میں جو لوگ حاضر تھے۔ ان میں ہل چل مچ گئی ؎

تیری چتون پھرتے ہی محفل میں ہلچل مچ گئی مضطرب کو مضطرب مضطر کو مضطر لے چلا

حکام کمروں سے باہر نکل کھڑے ہوئے مگر مفتی صاحب اجلاس سے نہیں سرکے، جو آپ کے پیشکار نے برآمدہ میں سے کمرہ میں آکر مفتی صاحب سے کہا۔ "جناب عالی غدر پڑ گیا۔ سرکار کمپنی کی ہندوستانی فوج اُس سے بگڑ گئی ہے۔ کل ۱۰ رمئی اتوار کے دن میرٹھ میں اس نے یوروپین لوگوں کا قتل عام کیا اور اب وہی فوج میرٹھ سے یہاں آگئی ہے۔ اور فرنگیوں کو چُن چُن کر تہ تیغ کر رہی ہے خزانہ لوٹ چکی ہے کشمیری دروازہ کا میگزین پھونک چکی ہے۔ شہر کے اندر دندناتی پھرتی ہے اور قیامت برپا کر رہی ہے شہر کے سب دروازہ بند کر لئے ہیں۔ حضور فٹن میں سوار ہوں اور کسی طرح شہر میں پہونچ جائیں۔" مفتی صاحب نے اس بیان کو حیرت سے سُنا اور کہا انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ غالیچہ پر سے اُٹھے اور باہر تشریف لائے اور گاڑی میں سوار ہو گئے۔ جب کشمیری دروازے کے پاس پہونچے تو دیکھا دروازہ بند ہے اور وہی پوربیہ سنتری بدستور پہرے پر کھڑا ہے۔ مگر تیور خراب ہیں، اُسے چاروں طرف سے لوگوں نے گھیر رکھا ہے اور اس پر تقاضا ہے کہ دروازہ کھول دے، وہ اوّل تو کسی کی بات کا جواب

ہی نہیں دیتا ہے اور جواب دیتا ہے تو یہ جواب دیتا ہے "ہمارے دھولے چابی نہیں اور تالا اسی کا اندر رہا۔ ادھر سے کیسے کھولت جائے ڈلی ڈلی"۔ حالانکہ مفتی صاحب کی گاڑی کشمیری دروازہ کے پٹوں سے جا لگی اور سنتری مفتی صاحب کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا مگر سلام نہ سلامی گویا ان تلوں تیل ہی نہ تھا۔ مفتی صاحب کے آدمیوں نے تیس منٹ تک دروازہ پیٹا اور چیخے کہ صدرالصدور کھڑے ہیں "دروزہ منہ میں ہے اور لو چلنے لگی ہے دروازہ کھولو"۔ مگر دربانوں کو سانپ سونگھ گیا تھا کوئی خبر بھی نہ ہوئی۔ تنگ ہو کر صدرالصدور صاحب کے پیشکار نے اسی پوربیہ سے کہا "ہزاری جی صدرالصدور صاحب بڑی تکلیف میں ہیں آپ کہہ کر دروازہ کھلوا دیجئے"۔

ہزاری کا لفظ سنکر پوربیہ سنتری پھولا نہ سمایا اور اُس نے کہا "اچھا ہجور"۔ اور اُس نے باہر سے دستک دی اور اندر والوں نے فوراً اتنا دروازہ کھولا کہ مفتی صاحب کی فٹن داخل ہو گئی۔ شاید فٹن کے پیچھے لگے ہوئے دو چار آدمی اور کشمیری دروازہ میں گھس آتے اور دربانوں نے جھٹ پٹ دروازہ کو بند کر کے قفل ڈال دیا۔ اگرچہ مفتی صاحب سے کسی نے کچھ روک ٹوک نہیں کی مگر مفتی صاحب نے شہر کو لٹتے گھسٹتے بےگناہوں کو ظالموں کے پنجہ میں گرفتار ضرور دیکھا۔ مفتی صاحب اس جانگداز سیر کو دیکھتے آنسو بہاتے اپنے دولتخانہ میں داخل ہو گئے۔

آپ نے سولہویں رمضان ۱۸۵۷ء کو عید کی آمد شہر کے اندر دیکھی اب اسی تاریخ کو عید کی آمد کی تمہید لال قلعہ میں بھی ملاحظہ کیجئے اور غور فرمائیے کہ لال قلعہ میں چودہ یا پندرہ دن رمضان کے کیونکر کٹے اور ۲۶ مئی ۱۸۵۷ء کو شوال کی عید کیونکر آئی۔

جب باغیوں کی سرکشی اور بندوقوں کی آوازیں لال قلعہ میں پہونچیں تو بادشاہزادے آپس میں اس طرح بات چیت کرنے لگے "کیوں آکا حضرت یہ دڑ دڑ پک کیسی ہے"

"دڑ دڑ پک کیا ہے، روسی فوج آگئی ہے کیونکہ روس میں فرنگیوں میں بڑی بیرا کھیری ہے، روس کے مورث نے اپنی وصیت لکھوا دی ہے میرے جانشین ہندوستان کو فرنگیوں سے کبھی نہ کبھی ضرور چھین لیں اور ہمیشہ اسی تگ و دو میں رہیں سو دن سنار کے ایک دن لہار کا۔ آج انہیں موقع لگ گیا ہے۔ اب ان فرنگیوں کو وہ ہندوستان سے کھڑے کھڑے نکال دیں گے، اچھا ہے، خس کم جہاں پاک، اور ان روسیوں میں یہ بڑی خوبی ہے کہ جس ملک کو فتح کرتے ہیں اس پر قبضہ نہیں کرتے ہیں، تاج بخشی کی نشانی کی ٹھکرائی اور چلے ہیں۔ خدا کو منظور ہے تو یہاں بھی یہی صورت ہوگی"

"نہیں، اماں روس کہاں سے آیا، ایران کی فوج کا ایک دستہ اترا ہے وہ قتل عام کرتا چلا آتا ہے"

تھوڑی دیر میں ٹڈی دل باغیوں کا قلعہ میں گھس آیا اور اس نے شہر کی طرح یہاں بھی جس یورپین مرد اور عورت یا بچہ کو پایا بکرے کی طرح حلال کر ڈالا اور لال قلعہ کو میدان کربلا بنا دیا۔ ان باغیوں میں بیشتر پوربیہ تھا جن کے نام مثلاً گنگا دین، ماتا دین، رام غلام تھے، سواروں نے دیوان خاص کے صحن میں اپنے گھوڑے باندھ دیئے۔ پیادوں نے دیوان عام میں بستر جما لئے اور ان میں سے ایک پوربی فوج کے بعض افسر اور سپاہی کندہ ناتراش شتر بے مہار کی شکل منہ اٹھا بادشاہ سلامت کی خدمت میں پہنچے اور کہنے لگے "اے دھرما اوتار آپ ہمارے سر پہ اپنی دیا کا ہاتھ رکھیں تو ہندوستان کا سولہ آنہ راج پاٹ ہم آپکو دلوا دیں۔ اوپر اور نیچے ہمارے گسیّان آپ ہی ہیں۔"

حضرت ابوظفر نے اس کا جواب دیا کہ "تم مجھے کیا سولہ آنے راج پاٹ لوا دو گے میں بادشاہ نہیں ہوں، اس لال حویلی میں پڑا اپنے بال بچوں کا پیٹ پال رہا تھا۔ تم نے آ کر فقیر کے بھیک کا ٹھیکرا اوڑا دیا اس بربادی کے دن سے پہلے یہ شعر کہہ چکا ہوں ؎

اے ظفر اب تم بھی تک انتظام سلطنت
بعد میرے نے دیکھا ہی نہ نام سلطنت

ان باتوں کو سنکر وہ سپاہی پوربیہ بولے "ہم جانت ہیں بوڑھو سٹھیا گئے ہیں۔"

مجھے غدر کے حالات لکھنے منظور نہیں، بلکہ میرا مدعا اس تفصیل سے یہ ہے کہ

آپ بخوبی معلوم فرمالیں کہ ۲۶ مئی یا یکم شوال یا عید کے دن تک شہر اور لال قلعہ کے لاہوری دروازہ سے دلّی کے لاہوری دروازہ تک دورویہ دکانیں دکانداروں سے خالی کرواکر باغی فوج خصوصاً پوربیہ اُترے ہوتے ہیں، یہ لوگ دال بھات یا پوریاں کچوریاں تک نہیں کھاتے ہیں صرف جلیبیوں سے پیٹ بھرتے ہیں، دلّی کے حلوائیوں کو حکم ہے کہ بہت تحفہ جلیبیاں تیار کرتے رہو نہیں تو سزا پاؤگے"!

اور ایک بیچارہ حلوائی کیا اس باغی فوج نے سب دکانداروں اور پیشہ وروں پر ظلم توڑ رکھا ہے، کم سے کم اس تاریخ تک ایک لاکھ باغی فوج شہر میں آگھسی اور چونکہ شہر و بازار کو اُجاڑتی، مالداروں کے گھر بگاڑتی چلی آئی ہے، اس لئے لاکھوں روپیہ لائی ہے، دلّی پہونچکر ہر باغی سپاہی نے اپنا روپیہ اور چاندی یہاں کے صرّافوں کو دے کر اشرفیاں بندھوالی ہیں یا سونا لے کر اس کی سلاخیں گھڑواکر اُن سلاخوں کو رانوں کے اوپر اور رانوں کے نیچے پہن لیا ہے اور وہ بلدار سلاخیں دھوتی میں چھپی رہتی ہیں، اشرفیوں کی ہمیانیاں کمر میں بندھی رہتی ہیں۔ گورا فوج اور دیسی وفادار فوج انگریزوں کے ساتھ میرٹھ سے لیکر غازی آباد، دلّی علی پور، نجف گڑھ تک پھیلی ہوئی ہے اور پنجاب سے سرکاری توپ خانہ اور سکھوں کی مددگار فوج یلغار کرتی چلی آتی ہے۔ کیونکہ لارڈ کیننگ گورنر جنرل کا حکم کمانڈر انچیف کے پاس صادر ہو چکا ہے کہ دلّی اور نواح دہلی کو بار دگر فتح کر لیا جائے، تجربہ کار فوجی افسروں نے پہاڑی جو سبزی منڈی کے پاس اور شہر دہلی

کی سطح سے ساٹھ فٹ اونچی ہے مورچہ بنانے کے لئے تجویز کر لیا ہے۔ تیس ہزاری باغ کے موٹے موٹے درخت کاٹ کر پہاڑی پران کی لکڑیاں اور تنے پہنچائے جا رہے ہیں تاکہ توپیں پھر پہیہ سے اُتر کر زنجیروں کے ذریعہ سے اُن کے ساتھ جکڑ بندی کر دی جائیں، یورپین افسر اور بیچ لوگ بابا لوگ غیرت مہر و ماہ ٹوکریوں میں مٹی بھر کر اور اپنے سروں پر رکھ کر لیجاتے ہیں اور دُھس بنانیوالوں کا ہاتھ بٹاتے ہیں اور گویا مضمون اِس شعر کا ادا کرتے ہیں ؎

آں نہ من باشم کہ روزِ جنگ بینی پشتِ من
آں منم کاندر میانے خاک و خوں بینی سرے

ہر صبح کو دلّی کے اندر باغی فوج کا افسر لڑائی کا بگل دیتا ہے مگر ایک بھی باغی اپنے بستر سے ہلتا نہیں ہے۔ اور بگل کی آواز سُنکر پڑے ہی پڑے کہتا ہے "کیوں ٹوں ٹوں لگاتی ہے۔ سُسر ہم لوگ ٹٹی بیٹھی جائے کر نہا کر کچھ کھا کر لونٹی وٹونٹی پیو کر لڑائی کو جاتے گا" جب ہزاری جی نے چاہا تو کارتوسوں کی پیٹی اور بندوقیں لے کر اپنی ٹولی کے ساتھ کشمیری دروازے یا موری دروازے کے باہر گئے مگر جب سرکاری فوج نے ان پر گولیاں برسائیں تو یہ پیٹھ دے کر بھاگے اور دروازے سے گھس دروازہ بند کر لیا، پوربیہ سپاہی لال قلعہ میں جا جا کر بادشاہ سلامت کو ستاتے ہیں۔ بڑھؤوں کا نام رکھا ہے۔ بار بار ان سے سرگوشی کرتے ہیں۔ بادشاہ فرماتے ہیں "میرے کان پوربیوں کے ووں آگا لالا ہیں"۔

مرزا ابو بکر صاحب بادشاہ کے پوتے زردوزی کے کارخانے میں کھڑے ہاتھی
کی جھول کو دیکھ رہے ہیں جو عید کے دن ہاتھی پر سجائی جائیگی۔ ہمیں زردوز اسے
کارچوب پر لگائے مصالحہ ٹانک رہے ہیں۔ مرزا صاحب بندوق پر زور دیئے کھڑے
ہیں۔ بندوق تیر بند ہے۔ مرزا صاحب کے اُلٹے ہاتھ کی بیچ کی اُنگلی بے دھیانی میں
بندوق کی نال میں تھوڑی سی گئی تھی، یکایک بندوق چل گئی۔ مرزا صاحب کی اُنگلی
تھوڑی سی اُڑ گئی اور گولی کارخانہ کی چھت میں جا کر گھس گئی۔ مرزا صاحب کے
ہاتھ سے خون بہنے لگا۔ حاضرین گھبرا گئے۔ اُس بہادر نے کہا "گھبرانے کی کیا بات
ہے، مارنا مرودن کا کام ہے۔ دیکھو حضور والا کو خبر نہ ہو۔ جرّاح کو چُپکے سے بُلا لو۔"
جرّاح آیا اُس نے مرہم پٹی کی اور مرزا صاحب ہنستے ہوئے کارخانے سے تشریف
لے گئے۔ جوں جوں عید قریب آتی جاتی ہے انگریزوں کی فوج جو شہر پر گھیرا
ڈالے پڑی ہے چیرہ دست ہو رہی ہے۔ پہاڑی کی طرف سے گولہ پر گولہ چلا آتا
ہے۔ نامراد باغی جو شہر میں گھسے پڑے ہیں۔ وہ بھی اور دلّی والے بے گناہ بھی
مرتے ہیں اور زخمی ہوتے ہیں۔ مرنے والوں کا گور گڑھا مشکل ہے کیونکہ شہر پناہ
کے دروازے کھل نہیں سکتے، مُردے پڑے سڑتے ہیں۔ باعزت اور شریف آدمیوں
نے انجام کو سوچ سمجھ کر اپنی لڑکیوں کے نکاح کچا پکا اور جنہیں کو جو لڑکا ملا ہے
اُسی سے کر دیا ہے۔ نہ منگنی نہ برات نہ ساچق نہ بری اور نہ ناچ کرتے ہیں۔ دلہن
کو ڈولی میں بٹھا دولہا کے ساتھ کر دیا ہے۔ اس قسم کے ہزاروں نکاح رمضان

بیبا ہو چکے ہیں۔ ہر جنس کی شہر میں کمی ہے۔ خصوصاً دودھ نہیں ملتا ہے کیونکہ
باہر فصیل سے آتا تھا، کسی کی ماں نے دھونس رکھا ہے جو باہر سے سحری کے
لئے دودھ لےکر شہر تک آئے اور اپنی جان گنوائے۔ عید پکڑنی دشوار ہے جب
دانتوں پسینہ آگیا جب خون پانی ایک ہو لیا تو ۲۶ مئی ۱۸۵۷ء کو عید ہوئی
مگر ایسی عید خدا پھر نہ لائے۔ مسلمان غریب میلے کچیلے تھے کیونکہ گھاٹ بند
تھے۔ دھوبی شہر میں قید تھے، کپڑے کون دھوتا، اور کہاں دھوتا۔ ہر دکاندار
کو اپنی جان کے لالے پڑے رہے تھے۔ جوتے والے بزاز وغیرہ گھروں میں بیٹھے رہتے
تھے۔ مذہبی فرض سمجھکر اپنے اپنے محلے کی مسجدوں میں دوگانہ ادا کر لیا۔ جامع
مسجد میں بھی عیدالفطر کی نماز ہوئی مگر لی دی سی کیونکہ انگریزی مورچہ کا
گولہ انداز ایسا استاد تھا کہ عید والے دن جو گولہ مارتا تھا جامع مسجد کے حوض
پر آکر گرتا تھا۔ لال قلعہ کے محلوں میں قیامت برپا تھی، بیگمیں دھاروں روتی
تھیں۔ ایک بادشاہزادی پیٹ سے تھیں، جائے ضرور میں جاکر بیٹھی ہی تھیں
جو گولہ گرا، نیچے کا دھڑ تو پچنے سے اڑ گیا۔ اوپر کا دھڑ چوکی پر رہ گیا۔ شہ اجالے
بادشاہ سلامت کی کچھیرا پلٹن کہاں؟ اوپر ہوگئی تھی۔ حضور والا نے شہزادوں
کے ساتھ لال قلعہ کی موتی مسجد میں نماز دوگانہ پڑھی، نہ سواری، نہ جلوس۔ سب کے
دل مرجھا گئے، آنکھوں میں آنسو آتے رہے، اس عید سے بدتر بقرعید اور بقرعید
سے بدتر محرم غدر میں آیا۔ یہاں تک کہ ۲۰ ستمبر کو انگریزوں نے دلی فتح کر لی۔

لال قلعہ اُجڑ گیا نہ عبد نہ لقمر اعبداللہ کا نام ہی نام ہے۔

فقیر فراقؔ کے والد ماجد فرماتے ہیں کہ تمہارے دادا صاحب کے بہت سے شاگرد لال قلعہ کے بادشاہزادے تھے اس لئے اکثر سلاطین ہمارے غریب خانہ پر آتے تھے اور ہمیں بھی لال قلعہ میں دوسرے تیسرے دن جانا پڑتا تھا، بادشاہ زادے نہایت ادب کے ساتھ ملتے تھے۔ میری عمر سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ نہ تھی، میرزا انجم بادشاہزادے میرے ہم عمر تھے اُن کو میرے ساتھ بڑی عقیدت اور اُلفت تھی۔ ایک دن میں میرزا صاحب کے پاس ان کی حویلی میں لال قلعہ کے اندر بیٹھا تھا۔ باتوں باتوں میں مینا بازار کا ذکر آگیا۔ میں نے کہا۔ "ارادت خاں نے بے اصل بات کو کیسا ثابت کرنا چاہا ہے۔ مینا بازار یا زنانہ بازار لال قلعہ میں کب تھا؟"

میرزا انجم صاحب: "میر صاحب کیا آپ نے زنانہ بازار اس عمر میں کبھی نہیں دیکھا جو آپ اُسکی ہستی سے انکار فرماتے ہیں؟"

میر صاحب: "بیشک میں تو یہی جانتا ہوں کہ مینا بازار کے مؤلف نے فرضی مینا بازار کی تعریف لکھی ہے۔"

میرزا صاحب: "نہیں جناب میر صاحب زنانہ بازار لال قلعہ میں اب تک موجود ہے، چلئے میں آپکو اُس کی سیر کرالاؤں۔"

میر صاحب: "اُس میں عورتیں سودا بیچتی ہونگی اور سودا لیتی ہونگی۔"

میرزا صاحب:- "جی ہاں یہی بات ہے۔"

میر صاحب:- "میں ایسے بازار کی سیر کرنی نہیں چاہتا۔ خدا رسول کے نزدیک گناہ، بادشاہ کے قانون کے خلاف۔"

میرزا صاحب اَڑ گئے کہ میں آپ کو زنانہ بازار ضرور دکھاؤں گا۔ لگے ہاتھ پاؤں جوڑنے اور قسمیں دینے اور فرمایا کہ آپ پر کوئی باز پرس آئے گی تو اُسے میں اوٹ لوں گا اور اپنا ایک تاج مرصع میر صاحب کے سر پر رکھا اور ایک تاج آپ پہنا اور میر صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال زنانہ بازار میں داخل ہو گئے۔ میر صاحب قبلہ فرماتے ہیں کہ گرمی سخت پڑ رہی تھی۔ دن کے تین بج چکے تھے مگر یہ معلوم ہوتا کہ دن کے بارہ بجے ہیں، بازار تنگ تھا جیسا چھوٹا دریبہ، دو رویہ دکانیں بنی ہوئی تھیں کسی دکان میں سُناری بیٹھی گہنا بنا رہی تھی، کسی دکان میں سادہ کار عورت کسی میں پھول والی، کسی میں ترکاری بیچنے والی، کسی میں تنبولن کسی میں نیلن وغیرہ وغیرہ بیٹھی تھیں۔ گرمی کی وجہ سے بازار عورتوں سے خالی تھا۔ اکّا دُکّا کوئی کا چھن واچھن دکھائی دے جاتی تھی۔ جب بیچ بازار میں پہنچے تو سامنے سے ناظر حبشی اور اس کے پیچھے دو اُسکے ماتحت حبشی آتے دکھائی دیتے، ناظر اس قدر تاڑنے والا تھا کہ اُس نے دور سے میر صاحب کو گھورنا شروع کیا اور جب قریب آیا تو اس نے میر صاحب کو مجرا کیا اور اُن سے کہا "یہ کون صاحب ہیں میں انہیں نہیں پہچانتا ہوں۔"

میر صاحب: "ناظر تم بہت بے تمیز آدمی ہو، کچھ پاس ادب تمہیں نہیں رہا۔ یہ ہمارے بھائی بنارس کے بادشاہزادوں میں سے ہیں۔ تم انہیں کیا جان سکتے ہو۔ ہٹ جاؤ۔ ہمارے سامنے سے نہیں غضب سلطانی میں آجاؤ گے۔"

میرزا صاحب کی ڈانٹ سن کر ناظر محلی کا نپا اٹھا اور کرا ماتنا کرا بات کہتا بھاگا۔ ادھر میرزا صاحب میر صاحب قبلہ کو زنانہ بازار کے دوسرے دروازہ سے نکال کر اپنی حویلی میں لے گئے اور فرمایا "کہئیے میر صاحب قبلہ کس طرح زنانہ بازار کی سیر کرائی اور ناظر محلی کو کیا برجستہ جواب دیا۔"

میر صاحب قبلہ:۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔ آج آپ نے پکڑوانے کا بندوبست کیا تھا، وہ تو گرم وقت تھا کوئی بیگم بازار میں نہ تھیں ورنہ جلدی بھانڈا پھوٹتا اور خدا جانے کیا گذرتی۔

میر صاحب قبلہ فرماتے ہیں کہ قلعہ معلیٰ میں ایک شادی رچی۔ میرے ملنے والے کئی شاہزادے تھے۔ بیٹی والوں نے مجھے الگ بلا وا دیا اور بیٹے والوں نے الگ۔ غدر سے بہت پہلے کا ذکر ہے۔ امی جمی تھی۔ لال قلعہ ابھی دولت سے بھرا پُرا تھا۔ محل شامیانوں اور آئینہ بندی سے بہشت بریں بنے ہوئے تھے۔ ایک طرف محل کے قناتیں لگا کر زنانی محاسرا کو وسیع کر دیا گیا تھا۔ قناتوں کے پیچھے تخت چوکی آراستہ کئے گئے تھے۔ ان پر بیگمیں رونق بخش تھیں اور ناچ رنگ پردے کے پیچھے سے دیکھ رہی تھیں، روشنی کوہِ طور کی تجلی کو مات

دیتی تھی۔ طبلہ کی تھاپ فلک الافلاک تک جاتی تھی۔ میں بھی بیٹھا ہوا تماشہ دیکھ رہا
تھا۔ پان الائچیاں گٹہ تقسیم ہو رہا تھا۔ عطر دم بدم ملا جاتا تھا۔ لنڈھایا جاتا تھا۔
ہر بادشاہ زادے کے سامنے کھنڈا لگا ہوا تھا۔ یکایک خواجہ سرا آیا اور اُس نے
کہا۔ ذرا آپ کو تکلیف کرنی پڑے گی۔ زنانہ قنات کے دروازے تک جانا پڑیگا۔
میر صاحب قبلہ اِس بات کو سن کر سخت پریشان ہوئے اور فرمایا مجھ سے اور
زنانی قنات سے کیا واسطہ۔ میرزا نجم صاحب نے میر صاحب کو سمجھایا کہ ناظر خواجہ سرا
حکم کے ماتحت ہوتے ہیں۔ آپ میرے کہنے سے خواجہ سرا کے ساتھ چلے جائیں۔
میرزا صاحب کی تاکید سے میر صاحب خواجہ سرا کے ہمراہ ہو لئے۔ چلنے سے معلوم
ہوا کہ قنات پردہ دُور تک چلا گیا ہے۔ چلتے چلتے قنات کا دروازہ ٹھاٹھ کا بنا
ہوا آ گیا جو پھولوں اور سبز سبز پتوں سے سجا تھا۔ روشنی خوب تھی۔ ہزار در ہزار گل
رُخسار نازنین خواصیں محلسرا کی ڈیوڑھی سے قناتوں کے اندر اور قناتوں سے
محلسرا میں آتی جاتی تھیں۔ خواجہ سرا نے میر صاحب سے کہا آپ قنات کے دروازے
پر ٹھہریں میں پانچ منٹ میں حاضر خدمت ہوتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ قنات میں چلا
گیا اور ذرا سی دیر میں پلٹ کر آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے بیس بائیس کے سن و سال کی ایک
عورت گوری چٹی تھی جس کا لباس قلعہ کی بیگموں جیسا تھا۔ سونے کا جڑاؤ زیور
اور پھولوں کا گہنا پہن رہی تھی۔ عطر میں ڈوب رہی تھی۔ وہ بے دھڑک میر
صاحب کے پاس آئی اور اس نے میر صاحب کی چٹ چٹ بلائیں لیں اور اُن کی آنکھوں

آنسو بہنے لگے۔ میر صاحب حیران تھے کہ الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ اور یہ عورت کون بلا ہے۔ وہ عورت بلائیں لے کر یہ کہنے لگی "تم قاری صاحب کے صاحبزادے ہونا، تمہارا گھر محتسب کی مسجد کے پاس ہے۔ تمہارا یہ نام ہے نا؟" میر صاحب نے فرمایا آپ جو کچھ کہتی ہیں ٹھیک کہتی ہیں۔ مگر آپ کون ہیں اور ہم غریبوں سے کیا سروکار ہے۔

عورت: "میاں میرا نام حسن زیب ہے۔ میں بہت کم عمر تھی جو تمہارے ابا جان مجھے لائے تھے۔ میرا نام حسن زیب تمہاری اماں جان نے ہی رکھا تھا۔ تمہاری عمر جب میں تمہارے گھر میں آئی ہوں دو برس سے زیادہ کی نہ تھی۔ میں تمہیں گود میں چڑھائے چڑھائے پھرا کرتی تھی۔ تمہاری اماں جان ابا جان مجھے اولاد کی طرح رکھتے تھے۔ تمہارے گھر میں جو ماما کام کرتی تھی وہ مجھ سے جلتی تھی، اس نے مجھے تمہارے گھر سے نکالنے کی تدبیر کی کہ مجھے بہکایا اور مجھ سے کہا "نگوڑی تو اس گھر میں لونڈیوں کی طرح رہے گی اور جوں جوں بڑی ہوگی پاپڑ بیلے گی۔ اٹھتے جوتی اور بیٹھتے لات ہوگی، اگر تو یہ چاہے کہ جیتے جی بہشت میں پہنچ جاؤں تو میرا کہنا مان، میں تجھے لال قلعہ میں بھجوا دوں گی۔ وہاں تو راج راجے گی۔" میں ماما کے بہکانے سکانے میں آگئی اور ماما نے ایک دن موقع پاکر اپنے گھر والے کی معرفت یہاں پہنچوا دیا بلکہ مجھے بیچ ڈالا۔ بادشاہی محلوں میں رہنے سے مجھے بیگموں کی خدمت کی پوری تمیز آگئی، اب میں ملکہ زمانی کی خواصوں میں داخل ہوں، دس چیلیاں میرے نیچے کام کرتی ہیں۔ توشک خانہ۔ جواہر خانہ میرے سپرد ہے۔ بیگم انعام اکرام اسقدر

دیتی ہیں کہ میں لیٹے لیٹے تھک جاتی ہوں۔ میں قنات کے چاک میں سے محفل کو دیکھ رہی تھی جو میری نظر تم پر پڑی اور میں نے تمہیں پہچان لیا۔ حضور عالیہ نے مجھے بے چین دیکھ کر فرمایا حُسن زیب کیا بات ہے۔ میں نے جو سچ سچ بات تھی وہ حضور عالیہ کی خدمت میں عرض کر دی۔ حضور عالیہ نے فرمایا میں تجھے سالہا سال سے آزما رہی ہوں، تو جھوٹ بولنا نہیں جانتی ہے۔ اگر تجھے اپنے مرشد زادے سے بات چیت کرنے کا ارمان ہو تو میری اجازت ہے۔ انہیں ڈیوڑھی پر بلوا لیجئے۔ حضور عالیہ کے فرمانے سے پھولی نہ سمائی اور میں نے خواجہ سرا کو تمہارے پاس بھیجا اور تم آ گئے دیکھو یہ ایک بٹوہ ہے، اس میں اشرفیاں ہیں، یہ اپنی اماں جان کو میری طرف سے نذر کر دینا، یہ دوسرا بٹوہ ہے اس میں روپے ہیں یہ تمہاری نذر ہے، اب جو تم محفل میں جاؤ تو کنچنی کو بیل میں دینا۔ یہ تیسرا بٹوہ بُن چکنیوں کا ہے اسے تم کھانا اور کھلانا اور میاں سید جو کچھ میں آپ کو نذر کر رہی ہوں، یہ میرا حلال کمائی کا پیسہ ہے اس کے لینے میں ہچکچاؤ نہیں۔"

میر صاحب:"یہ گوٹہ اور بُن کا بٹوہ میں لئے لیتا ہوں مگر روپیہ اشرفیوں کا بٹوہ بغیر اپنے والد ماجد کی اجازت کے نہیں لے سکتا ہوں اور میں ناچ گانے کی محفلوں میں کبھی شریک نہیں ہوں۔ صاحب عالم نے دعوت میں بُلایا تھا اور میں چلا آیا تھا۔ اگر مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ ناچ رنگ بھی محفل میں ہوگا تو ہرگز نہ آتا۔"

حُسن زیب سر سے پیر گئی مگر میر صاحب نے اُس کی نذر قبول نہ کی اور محفل

میں چلے آتے تھے۔ گھر آ کر میر صاحب نے بڑے میر صاحب اور اپنی والدہ صاحبہ کو حسن زیب کا قصہ سنایا تو دونوں صاحبوں نے فرمایا وہ سچ کہتی ہے۔ ہم نے اُسے برسوں تلاش کروایا مگر اُس کا پتہ نہ لگا۔ جنگل میں بستی اور شہر میں ڈھنڈورہ کیا، خبر تھی کہ حسن زیب لال قلعہ میں براج رہی ہے۔

جب گرمی اور گھٹس بہت ہوتی تھی اور ہوا نہ چلتی تھی تو بادشاہزادوں اور شاہزادیوں کا یہ اعتقاد تھا کہ اگر بارہ پرندوں کے ایک سانس میں نام لیے جائیں بشرطیکہ ان بارہ پرندوں کے نام میں اوّل ب ہو تو ہوا ضرور چلنے لگتی ہے اور بارہ پرندوں کے اس قسم کے نام تلاش کر کے نکال بھی لیے تھے وہ یہ ہیں۔ بگلہ۔ بلبل۔ باز۔ بٹیر۔ باشہ۔ بحری۔ بیّہ۔ بھجڑ۔ پپیا۔ بھنبیری۔ بھنگا۔ بط۔

مگر ایک سانس میں بارہ کے نام مشکل سے لیے جاتے تھے، لینے والے کا سانس ٹوٹ جاتا تھا اور ہنسی ہوتی تھی اور کسی نے ایک سانس میں بارہ نام لے لیے تو کہا جاتا وہ دیکھو درخت کی پھننگ ہوا سے ہل رہی ہے، ہوا خوب چلے گی۔

جامع مسجد کا شاہی دروازہ جو پورب کی طرف ہے، اس کے نیچے نخاس بھی تھا۔ گھوڑا اونٹ بکا کرتے۔ اور جہاں اب ٹرامویز کا اسٹیشن ہے یہاں ایک شیر پنجرے میں بند رہتا تھا اور اس مقام کو شیر کا پنجرہ کہتے تھے، شیر کے پنجرے کے

پاس ہی بنازہ تھا۔ کبوتر اسی دروازے کی سیڑھیوں پر بکتے تھے۔ کبوتر خریدنے کے
واسطے لال قلعہ کے بادشاہزادے بھی آجاتے تھے۔ اسی دروازے کے نیچے جہاں
سرمد صاحب مدفون ہیں صبح کے وقت شہر کے رہنے والے بادشاہی نوکر اکٹھے ہوتے
تھے اور لال قلعہ میں کل جو کچھ معاملات گذرے ہیں کھڑے کھڑے اُن کا ذکر چھیڑتے
تھے۔ اور لال قلعہ میں اپنی اپنی نوکریوں پہ چلے جاتے تھے۔ بادشاہی نوکروں میں
ایک قاضی گر بھی تھا جو قلعے کے لاہوری دروازے کے چھتہ میں بیٹھا کام کیا کرتا
تھا۔ مگر اس قدر ہوشیار اور چالاک تھا کہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے قلعہ کے سارے
حالات معلوم کر لیتا تھا کیونکہ اس کا ٹھیا عین گذرگاہ پہ تھا۔ ادنیٰ اعلیٰ سب
وہاں سے باتیں کرتے آتے جاتے تھے۔ یہ اُن کی باتوں کو سُن کر توڑ جوڑ حالات
کے لگا لیتا تھا اور شہر میں آکر لوگوں سے کہتا تھا آج بادشاہ سلامت سے
اور ڈپٹی کمشنر صاحب سے یہ بات چیت ہوئی۔ حکیم احسن اللہ خاں صاحب نے بادشاہ
سلامت سے یہ بات عرض کی حضور والا نے اُنہیں یہ جواب دیا۔ بڑے بڑے
منصب دار حیران تھے کہ اس ادنیٰ آدمی کو تخلیے کے بھید کیونکر معلوم ہو جاتے
ہیں ؎

سرِ خدا عارف کامل بکس نگفت   در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

نبی خاں صاحب نے فرمایا "شکارپور ضلع بلند شہر کے رہنے والے میر الفت علی نام

ایک سپاہی تھے وہ جب دلی آتے تو بارہ دری میں تمہارے نانا صاحب کے
پاس ٹھہرا کرتے تھے۔ غلیلچی بکمال تھے۔ اُن کا غلہ کبھی خطا نہ کرتا تھا۔ غلہ لگانے میں
وہ کمال دکھاتے تھے۔ لال قلعہ میں بہت سے شاہزادے آ کے شاگرد تھے۔ ایک
غلہ وہ آسمان کی طرف پھینکتے جب وہ غلہ بہت اونچا چلا جاتا تو دوسرا غلہ
پچھلے غلے میں ایسا مارتے کہ پہلا غلہ ٹوٹ کر نیچے گر پڑتا۔ پھر اسی طرح سینکڑوں
غلے غلوں سے توڑتے جاتے تھے اور ایک غلہ بھی خطا نہ کرتا تھا۔ جب ان کی آنے
کی اطلاع لال قلعہ میں ہو جاتی تو شاہی باورچی خانہ سے ایک بہنگی کھانے کی
اسی وقت اُن کے پاس پہنچا کرتی تھی۔ چلمن کے پیچھے سے حضور جہاں پناہ اور
بیگمیں اُن کے غلیل کے کرتب دیکھا کرتی تھیں اور اُن کے طفیل میں ہم بھی تماشہ
دیکھ لیا کرتے تھے۔ لوہے کا توا نشانہ پر رکھا جاتا تھا اور میر صاحب لوہے کے
غلے سے اس توے کو توڑ دیتے تھے۔ مٹی میں روئی ملا کر غلہ بنایا کرتے جو بہت مضبوط
ہوتے تھے۔ ہرن کی ٹانگ اس سے ٹوٹ جاتی تھی۔ میر الفت علی صاحب خوشنویس
بھی پورے تھے۔ کلام مجید روز لکھا کرتے تھے۔ ولی عہد بہادر کے سامنے کربلائے
معلیٰ جانے کا حال کہتے تھے کہ میں پیدل جا رہا تھا۔ ایک بستہ میں کچھ کاغذ دوات
قلم اور دو جوڑے کپڑوں کے بھی تھے۔ کربلائے معلیٰ ابھی دو منزل تھا کہ ایک
چور یا بدو گھوڑوں پر سوار آ گئے میں نے اُن کے پاس پہنچ جانے سے پہلے ہی غلیل
اور غلے رستہ سے الگ ڈال دیئے۔ جب وہ نزدیک آئے تو انہوں نے کہا۔ جو کچھ

تیرے پاس ہے ڈال دے۔ اُن کی بولی عربی تھی، میں نے اپنا بستہ اُن کی طرف پھینک دیا، وہ دس سوار تھے اور ہتھیار بند ان میں سے ایک شخص گھوڑے سے اُترا اور اُس نے میرا بستہ کھول کر دیکھا اور پھر اُس کو باندھ کر اپنے ایک ساتھی کو دیدیا پھر مجھ سے کہا۔ اپنی کمر دکھاؤ اور یہ کہہ کر اُس نے میری جیب اور کمر ٹٹولی اور جو کچھ روپیہ میرے پاس سے نکلا وہ لے لیا۔ میں نے کہا حسینؑ کا واسطہ ایک چونّی مجھے دیتے جاؤ تاکہ میں کچھ رستے میں کھجوریں لے کر کھاتا چلا جاؤں اور کربلا پہنچ جاؤں، میری عربی بولنے پر انہیں حیرت ہوئی اور کہہ کر چل دیئے کہ ہم رحم کرنا بُرا جانتے ہیں۔ اب میں نے غلیل لے کر ایک غلہ ایک سوار کے گھوڑے کے ایسی نازک جگہ پر مارا کہ اُس نے بلبلا کر اپنے سوار کو زمین پر گرا دیا اور اسی طرح کئی سواروں کو میں نے زخمی کر کے خاک پر ڈال دیا۔ میں نے اُن سے کہا میں نے تمہیں غیر معمولی سزا دی ہے، میرا غلّہ مُنہ میں لگے گا اور دانتوں اور حلق کو توڑ کر گُدّی سے نکل جائے گا چوروں نے مجبور ہو کر میری پونجی اور میری ہمیانی پھینک دی اور چنپت ہوئے۔ دلی عہد بہادر نے فرمایا میر صاحب آپ نے اس فن میں اپنے سے زیادہ کسی کو پایا۔ میر صاحب نے کہا۔ میرے وطن میں میرا ایک باغ ہے ایک دن میں دیکھنے کے لئے گیا۔ غلیل میرے ہاتھ میں تھی، ایک پوربیہ سائیس باغ کی مینڈ پر بیٹھا گھر سے گھاس کھود رہا تھا، میں نے اُسے للکارا۔ کہا میرے گھر کیوں بگاڑتا ہے۔ اُس نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ مجھے غصّہ آگیا، میں نے

ایک غلّہ اُس کے مارا اُس نے غلّہ کھرپے کی دھار پر روکا اور غلّہ دو ٹکڑے ہو کر گر
گیا۔ اسی طرح میں نے پچاس غلّے سائیس کے مارے اور سب اُس نے کھرپے کی دھار
پر روک کر توڑ دیئے۔ اور ایک بار میں جنگل میں شکار کی تلاش میں پھر رہا تھا جو ایک
نوجوان راجپوت سے ملاقات ہوئی۔ سر پر اُس کے پٹی بندھی ہوئی تھی اور اُس کے ہاتھ
میں سانگ یعنی چھوٹا سا بھالا تھا۔ مجھ سے اُس نے کہا آپ غلیل سے کیا شکار
کریں گے۔ میں نے کہا تیتر بٹیر اور کیا۔ اُس نے کہا ان غریب جانوروں کے لئے
غلیل یا بندوق کی کیا ضرورت ہے آپ انہیں جھاڑیوں سے اُٹھایئے اور میں
ہاتھ سے پکڑوں گا چونکہ شیر شاہ کھوری نے جاتے قصبہ کے جنگل میں شکار
گاہ بنائی تھی اس لئے اُس کے نواح میں قسم قسم کا شکار اب تک وہاں ملتا
ہے اور اسی وجہ سے اس کے متصل آبادی جو ہوئی اُس کا نام شکار پور ہو گیا
خلاصہ یہ ہے کہ میں نے جھاڑی کو لکڑی سے کھٹکھٹایا اور اُس میں سے دو تین
تیتر جنگلی کہیں اُڑے اور راجپوت نے اس پھرتی سے انہیں اُچک کر پکڑا کہ دیکھ کر
حیرت ہوئی اور تھوڑی دیر میں اُس نے پندرہ تیتر وغیرہ پکڑ دیئے اور میں نے
انہیں زندہ اپنی چادر میں باندھ لیا۔ راجپوت نے کہا آپ کے لئے تو شکار ہو گیا
اب میرا شکار بھی ڈھونڈ دیجئے، میں نے کہا وہ کیا۔ اُس نے کہا سور، میں نے کہا
بہتر ہے ہم اُس کی تلاش میں جھاڑیوں کو دیکھتے پھرتے تھے۔ جو جنگلی سور راجپوت
کے سامنے آ گیا۔ راجپوت نے نیزا بدل کر اپنا سانگ اس طاقت سے مارا کہ سانگ

گئی آنی اس کے سر اور سینہ اور کوکھ توڑ کر اس کے کولھوں میں سے نکل گئی۔ اور
سور بے جان ہو کر خاک پر گر پڑا۔ میں نے کہا واہ کنور صاحب آپ کی ضرب دست کا
کیا کہنا مگر نشانہ خطا کرتا تو آپ کو جنگلی جانور زندہ بھی نہ چھوڑتا۔ راجپوت
نے اس کا جواب نہ دیا اور اپنے مُردہ شکار کو ڈھاک کی جڑ کے سہارے سے
کھڑا کر کے اس نے اپنے سانگ کو شکار کے سر میں پہلے زخم پر مارا۔ برچھی کی
نوک اسی رستے سے نکل گئی اور اس طرح سو بار اس نے برچھی کو شکار کے
زخم پر مارا اور جہاں سے پہلی دفعہ برچھی کی نوک نکلی تھی سو بار وہیں سے
نکلی۔ کہنے لگا میرا نشانہ خطا نہیں ہوتا ہے۔ میں نے کہا بیشک آپ نے
آنی کی بڑی مشق کی ہے۔

میر الفت علی صاحب بنا ارشنی اچھی جانتے تھے۔ اگر دشمن ان کے
برچھی مارتا تھا تو وہ خالی دیکر برچھی اپنے دانتوں سے پکڑ لیتے تھے۔ میر صاحب
کی غلیل اس قدر کڑی ہوتی تھی کہ تین چار جوان آدمی مل کر اسے زہ نہ کر سکتے
تھے یا چلہ نہ چڑھا سکتے تھے۔

دہلی کے رہنے والے ایک مغل بچے تھے انہیں لڈو کے نام سے بڑی نفرت
تھی۔ لال قلعہ کے بادشاہزادوں نے ان کا لقب مرزا لڈو بیگ رکھ دیا تھا اور
مرزا لڈو بیگ لڈو کے نام سے چڑتے تھے مگر وہ دوسرے لڈو کھا لیتے تھے مثلاً

لال قلعہ میں کسی بادشاہزادے کے سلام کو گئے۔ بادشاہزادے صاحب نے
نوکر کو اشارہ کیا، اُس نے سیر و سیر لڈو لاکر دیوان خانہ کے طاق میں رکھدیئے
اور میر صاحب کو صاحب عالم نے حکم دیا کہ دیکھئے اُس طاق میں ایک گلدستہ
رکھا ہے اُسے اُٹھا لیجئے میر صاحب طاق کے پاس پہنچے تو دیکھا طاق میں
گلدستہ کی بجائے ایک طباق لڈوؤں سے بھرا رکھا ہے۔ اب کیا تھا لڈو بیگ
بپھر گئے۔ پہلے تو اُنہوں نے صاحب عالم کے نوکروں کو گالیاں دیں، پاجی ہیں
ایسے ہیں، ویسے ہیں، بدمعاش ہیں جس سے مجھے چڑ ہے وہی میرے سامنے
لاکر رکھی ہے۔ پھر صاحب خانہ کی دھجیاں لینی شروع کیں، خدا اس لال قلعہ
کو اُجاڑے۔ لال قلعہ والوں نے سر سے کنواں کھود رکھا ہے۔ نادرشاہ ایک
پھیرا ایران سے دلی کا اور کرے تو مزہ آئے۔ پہلے پھیرے میں تو دلی کے اندر
یہ مثل بن گئی۔ پہلے نادرشاہ جنہوں نے مغلوں سے چکیاں پسوائیں اُس نے
دلی پہونچکر یہ حکم دیا تھا کہ لال قلعہ کے سلاطین عورتوں کی طرح چکیاں لیکر
بیٹھیں اور میری فوج کے گھوڑوں کے لئے دانہ دلیں اور نادری حکم پورا ہوا
اور مثل بن گئی۔ کہلا نادرشاہ جس نے مغلوں سے چکیاں پسوائیں۔ مجھے
غریب سمجھکر چھیڑتے ہیں۔ مائیاں ملی ہیں یا کوئی نہیں ملا ہے۔ میاں کو پیس
گھلوا دے گا۔ لڈو جو میرے جانی دشمن ہیں انہیں میرے لئے لگا رکھا ہے مگر
میں اپنے دشمنوں کو کب سلامت چھوڑنے والا ہوں، سب کو نگل جاؤں گا،

کروا تے اور دو بجے رات کو مع اپنے ماتحت نوکروں کے چھکڑوں میں بیٹھ کر اُس طرف کو چل دیتے جس طرف راجہ صاحب شکار کا ارادہ فرما چکے تھے۔ صبح ہوتے ہوتے کسی گاؤں کے قریب پہنچ جاتے۔ گاؤں کے کتّوں کا قاعدہ ہے کہ جب گاؤں کے پاس سے سواریاں گذرتی ہیں تو وہ بھونکتے ہوئے سواریوں کے پاس آجاتے ہیں، میرزا گوہر بیگ کے چھکڑے کے پاس کتّے آجاتے تو مرزا صاحب انہیں قیمہ اور پراٹھے ڈالتے اور کتّے وہ کھانا رغبت سے کھاتے اور دُم ہلانے لگتے۔ دس بیس کتّوں میں سے دو چار کتّے موٹے تازے چھانٹ کر اُن کے گلے میں پٹہ ڈال کر ڈوری لگا کر اُن کو اپنے چھکڑے میں بٹھا لیتے۔ کتّے چوں نہ کرتے اور چھکڑے میں آجاتے اور میرزا صاحب اُن کی آنکھوں پر ٹوپی چڑھا دیتے۔ اسی طرح دو تین گاؤں سے کتّے چھانٹ کر شکار گاہ میں لے آتے، اس میں راجہ صاحب بھی جا پہنچتے۔ میرزا صاحب کتّوں کو پاس سنگوا دیتے۔ لیں کتّے پیوست ہو جاتے جہاں شیر ہوتا۔ ...نکالا جاتا ٹوپی اُتار کر کتّوں کو چھوڑ دیتے، دیکھنے والے دیکھتے کہ کتّوں کی آنکھیں چراغ کی طرح روشن ہیں۔ کتّے شیر کو جا چمٹتے، کوئی دُم میں کوئی حلقوں میں جا چمٹتا، ...کی طرح لٹک جاتے۔ شیر دو چار کتّوں کو چبا بھی ڈالتا مگر کوئی بھاگتا نہ تھا۔ کتّے شیر کو آدھا کر لیتے اور راجہ صاحب تماشہ دیکھ لیتے تو شیر بندوق سے مار دیا جاتا۔ اور شکار ختم ہو جاتا۔

شاہنشاہ جہاں پناہ حضرت محی الدین اورنگ زیب عالمگیر ایک روز صبح کے وقت لال قلعہ کے جھروکہ درشن میں بیٹھے وظیفہ پڑھ رہے تھے، دریا کا پاٹ بڑی دُور تک چلا گیا تھا کیونکہ برسات کا سماں تھا، چنانچہ لال قلعہ کی نیو کو چوم رہی تھی اور پانی زور سے بہہ رہا تھا۔ کیونکہ بڑھ رہے تھے۔ یکایک حضور والا نے ایک گول دریا میں دیکھی جو ڈوبتی اُچھلتی پانی میں چلی جاتی تھی۔ حضور والا نے غلام کی طرف ہاتھ کا اشارہ کیا کہ یہ گول جو دریا میں لڑھکتی پڑھکتی چلی جاتی ہے اسے دریا سے نکلوا کر حاضر حضور کرو۔ اسی وقت حکم کی تعمیل ہوئی۔ پیراک لوگ دریا میں کود سے اور گول دریا سے نکال کر شہنشاہ کے سامنے لے آئے، دیکھنے سے معلوم ہوا کہ رانجھن گول ہے۔ اس کا منہ طباق کے ساتھ گِل حکمت ہو رہا ہے اور اس کے اوپر کپڑا بندھ رہا ہے:

حضور والا: "اوہو اس قدر مضبوطی سے منہ بند کیا ہے، غالباً دال میں کالا ہے کوتوال صاحب کو بلاؤ۔"

کوتوال صاحب فوراً حاضر ہو گئے۔

شہنشاہ: "جناب کوتوال صاحب اس گول کو کھول کر دیکھئے اس میں کیا شے ہے۔"

کوتوال صاحب نے ڈھکنا سرکایا تو معلوم ہوا ایک انسان کی لاش ہے جس کی عمر پچاس برس کی ہو گی، منہ پر ڈاڑھی ہے، لبیں کتری ہوئی ہیں، سر کے بال کندھے تک ہیں، گلے میں تانت کا پھندا ہے جس کے ذریعہ سے جان لی گئی

ہے۔ لاش گول سے نکال کر چارپائی پر رکھی گئی۔ حکم ہوا کہ اسے کوتوالی کے دروازے پر بچھا کر
رکھو اور ڈھنڈورا پٹوا دو کہ خاص و عام لاش کو پہچانیں۔ تیسرے روز کفن پہنا کر
نماز جنازہ پڑھوا کر میت کو گور غریباں میں دفن کروا دو۔ قاتل پیدا کرو۔
کوتوال نے چوتھے روز دربار میں آکر عرض کی کہ نامعلوم میت دفن کر دی گئی کسی نے
اسے نہیں پہچانا۔ مگر غلام نے قاتل کو گرفتار کر لیا ہے جس کی روداد یہ ہے کہ فدوی
نے کمہاروں کو بلا کر گول دکھائی اور کہا کہ بتاؤ یہ گول کس نے بنائی ہے۔ سب نے
انکار کیا مگر ایک کمہار نے کہا کہ ایک کاریگر تیلی واڑے کا رہ گیا ہے ہو نہ ہو اسی کے
ہاتھ کی ہو۔ اسے بلا کر پوچھئے۔ میں نے تیلی واڑہ والے کو بلا کر پوچھا اس نے فوراً
کہا کہ میں نے یہ سات گولیں بنائی تھیں اور فلاں فلاں شخص کے ہاتھ بیچیں۔
یہ گول ایک باورچی مجھ سے لے گیا تھا جس کی دوکان چاندنی چوک میں ہے
اس کی دوکان پر سات دن کھانا بکتا ہے اور مسافر اس کی دوکان سے کھانا
بہت لیتے ہیں۔ چنانچہ یہ فدوی کمہار کو لے کر باورچی کی دوکان پر گیا۔ باورچی
نے کہا یہ گول میں بیشک اسی کاریگر سے لایا ہوں اور اس گول کو سربند
کر کے دریا میں بھی میں نے ڈالا ہے اور لاش بھی میں نے اس میں ڈالی ہے
تو فدوی نے باورچی سے کہا تم قاتل ہو جرم کا اقبال کرو۔ باورچی نے کہا
میں تمہارے روبرو اقبال جرم نہ کروں گا۔ بادشاہ سلامت کے روبرو حضوری میں
اقبال کروں گا۔ ناچیز کو بادشاہ جہاں پناہ کے آگے پیش کیا جائے تو فدوی باورچی کو لایا ہے

کر سکے لے آیا ہے، اجازت ہو تو پیش کیا جائے"۔

بادشاہ سلامت۔ "باورچی کو لاؤ"۔

باورچی حاضر ہو کر آداب بجالایا۔ بادشاہ نے اشارہ کیا جو کچھ کہنا ہے کہہ ڈالو۔

باورچی:۔ غریب پرور فدوی کی دوکان پر کھانے کی بکری بہت ہے کیوں کہ فدوی کھانا ایمانداری سے پکاتا ہے اس لئے خریدار ہوتا ہے۔ گاہک پر گاہک ٹوٹتا ہے۔ پورب پچھم کے مسافر میری دوکان پر ہی ٹھیکی لیتے ہیں اور کھانا کھا کر تعریف کرتے چلے جاتے ہیں۔ میری دوکان کے دو حصے ہیں ایک میں کھانا پکتا ہے۔ دوسری میں کھانا رکھا جاتا ہے۔ یہاں شطرنجی چاندنی کا فرش ہے مسافر یہیں کھانا کھاتے ہیں، دوکان کے اوپر ایک کمرہ بھی میرے پاس ہے۔ وہ کمرہ بھی فرش فروش سے آراستہ رہتا ہے۔ نیچے جگہ نہیں رہتی تو کمرے پر کھانے والوں کو بھیج دیتا ہوں تاکہ آرام سے کھا سکیں۔ آج چوتھا دن ہے کہ یہ مقتول میری دوکان پر دن کے دس بجے آیا اور کہا کھانا لاؤ، نیچے جگہ نہ تھی میں نے کہا یہ زینہ ہے کمرہ پر جائے کھانا بھیجتا ہوں یہ کوٹھے پر گیا اور میرا لڑکا اسے کھانا دے آیا۔ اور پانچ منٹ بعد دو مسافر آئے اور انہوں نے مجھ سے کہا ہمارا بھائی مسافر اس صورت کا تمہارے ہاں کھانا کھانے تو نہیں آیا۔ میں نے کہا آیا ہے، کمرے پر کھانا کھا رہا ہے۔ کہا ٹھیک ہے، لو یہ روپیہ ہمارے لئے بھی کھانا کوٹھے پر بھیج دو۔

یہ کہہ کر دونوں مسافر تو ختم کر لینے کو کوٹھے پر چڑھ گئے میرا لڑکا اُن دونوں کو بھی
کھانا دے کر چلا آیا۔ کچھ دیر بعد جو لڑکا اوپر گیا تو اُس نے دیکھا کہ پہلے مسافر کے گلے
میں تانت کا پھندا ہے اور فرش پر مُردہ پڑا ہے۔ اور پچھلے دونوں مسافر غائب
ہیں۔ لڑکے نے مجھ سے یہ حال کہا تو میں اوپر گیا، مُردہ کو ٹٹولا معلوم ہوا کہ کمر
میں سے مال کھول کر لے گئے ہیں۔ میں نے کمرے کو قفل لگایا اور رات کے وقت
جس طرح بن پڑا اسے گودی میں اُتارا اور جمنا میں بہا دیا مگر گودی لال قلعہ سے
آگے نہ گئی اور چوتھے دن حضور کی نظر سے گذری۔ یہ غلام اور غلام زادہ حاضر
ہیں پھانسی دیجئے گردن لیجئے۔"

حضور والا نے یہ بیان باورچی کا سن کر کہا اچھا تم دونوں باپ بیٹے بری ہو
اپنے گھر جاؤ اور کوتوال صاحب قاتل آپ پیدا کیجئے ورنہ قاتل اپنے تئیں سمجھئے"
دربار برخاست ہو گیا۔ کوتوال بادشاہ کا عتاب دیکھ کر زرد ہو گیا آداب
بجا لایا اور کوتوالی کو چلا گیا۔

حضور والا تخلیہ میں رونق افروز ہیں جو کوتوال آیا اپنا سر حضور کے قدموں
پر رکھ دیا۔

شاہنشاہ۔ قدم بوسی بدعت سیئہ ہے میں پیرزادہ نہیں ہوں جو لغویات
پسند کروں، آدمیوں کی طرح سیدھے کھڑے ہو اور جو کہنا ہو صاف صاف کہو۔

کوتوال: حضور والا کی ساری رعیت اور سارے ملازم حضور کو ولی مانتے ہیں۔ میں اس مقدمہ کی تفتیش میں باہر جانا چاہتا ہوں حضور روحانی طور پر فدوی کی مدد کریں۔

حضور والا: اے عزیز! مددگار حقیقی خدا ہے مگر مسلمان پر مسلمان کا حق ہے، اس لئے میں تمہیں چند نکتے سمجھاتے دیتا ہوں انہیں پلہ میں باندھو، مقتول کا تہ بند کرتا ساتھ لو اور فلاں سمت کو چلے جاؤ، چنیں چناں چناں چنیں۔ یہ وہ۔ وہ یہ بس خدا حافظ۔

دس بجے دن کے بنارس سے درے تین کوس پرے شیر شاہ کی سڑک کے نیچے درختوں کی چھاؤں میں سات شتر سوار اترے ہوئے ہیں۔ کنواں پاس ہے اس لئے ڈول بھر بھر کر اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں۔ اُن کا لباس مارواڑی ہے۔ اونٹوں کو پانی دے کر خود کھانا کھا رہے ہیں۔ یکایک دو راہگیر اور اُن شتر سواروں کے پاس آکر درختوں کے نیچے بیٹھے جو رنگ کے کالے تھے، اُنکی ڈاڑھیاں بکرے کی سی بچکی تھیں۔ قد دراز تھے۔ گلے میں گزی کے کرتے۔ ٹانگوں میں سُوسی کے تہ بند تھے۔ جوتیاں ادھوڑی استر کی پہن رکھے تھے اُنہوں نے اپنی گٹھڑیوں سے دو لکڑی کے برتن نکالے، دو تھیلیوں میں سے ستو اور گڑ نکالا اور شتر سواروں سے کہا آپ بھی مسلمین اور ہم بھی مسلمین ہیں اجازت ہو تو آپکے ڈول سے جو اناره پیم

پڑا ہے پانی بھر کر پی لیں۔ نہیں لٹیا ڈور ہمارے پاس بھی ہے۔ اس سے بھر لیں گے۔"

شتر سواروں کا افسر۔ "تمہارا ہی ڈول ہے۔ ہمارے بھائی ہو شوق سے پانی بھرو۔"

دونوں مسافر ستو کھانے پینے میں مشغول ہوتے اور شتر سوار آپس میں چپکے چپکے باتیں کرنے لگے۔ ایک بولا۔ "حلیہ لباس سب کچھ مل گیا پکڑ لیجیے۔" دوسرا "ذرا صبر سے کام لو۔" جب راہگیر کلی کر چکے تو شتر سواروں کے افسر نے کہا "لو یہ حقہ ہے پی لو۔" دونوں حقہ کی خوشبو پر لوٹ ہو رہے تھے۔ کہتے ہی شتر سواروں کے حلقہ میں آ گئے اور بیٹھ کر حقہ پینے لگے۔

شتر سواروں کا افسر۔ "بھائیو تم نے دلی بھی دیکھی؟"

راہگیر۔ "نہیں صاحب ہم نے دلی نہیں دیکھا۔" مگر اس کے ساتھ ہی اُن کے چہرے فق ہو گئے۔

شتر سواروں کا افسر۔ "تم نے دلی نہیں دیکھا تو ہم تمہیں دلی ابھی دکھاتا ہے۔"

یہ کہہ کر شتر سواروں کا افسر اور اس کے ساتھی اُن سے لپٹ گئے۔ انہیں باندھ کر ڈال دیا۔ خرجین میں سے ہتھکڑیاں بیڑیاں نکال انہیں پہنا دیں اور پولیس کی وردی پہن کر خود دلی کے کوتوال اور کوتوالی کے برق انداز بن گئے اور ہتھیار لگا کر ملزموں کو اونٹ پر بٹھا پاس کے تھانے میں لے گئے اور ضابطے کے ساتھ اسی طرح ورد لیتے ہوتے دلی پہنچے اور شہنشاہ کو آداب بجا لاتے۔ حکم ہوا کل دربار میں مع گواہوں کے حاضر کیے جائیں۔

دیوان عام سے لے کر تمام لال قلعہ کے لاہوری دروازے تک آدمی پٹا پڑا تھا اور حضور شہنشاہ اورنگ زیب تخت طاؤسی پر جلوہ افروز تھے نقیبوں کی آوازوں سے سننے والوں کے دل دہلے جاتے تھے۔ کوتوال مع دونوں ملزموں اور باورچی اور اس کے بیٹے کے حاضر تھے چونکہ مقدمہ خون کا تھا اس لئے اعلیٰحضرت خود سماعت فرما رہے تھے۔ حضور والا کے اشارے پر باورچی اور باورچی کے لڑکے نے عرض کی بیشک یہی دونوں شخص ہیں جو مقتول کے بعد ہمارے گھر سے پر آئے اور کھانا منگوا کر سب کھاتے فرار ہو گئے۔ ملزم کٹہرے میں پیش ہوئے۔
خود بدولت "کو تم نے قتل کیا ہے مگر تم سچ سچ حال اپنی جماعت کا کہہ دو گے تو چھوڑ دیے جاؤ گے۔ کیونکہ سلطنت تم سے بہت سا کام لینا چاہتی ہے"
حلفاً علفی کے بعد ملزموں نے یہ اظہار دیے۔

اظہار

حضور والا ہم ٹھگ لوگ ہیں، ٹھگنے کے دستور کو ٹھگ بدیا کہتے ہیں، وہ ہم اپنے چیلوں کو سکھاتے ہیں ہم کلکتہ سے پشاور تک پھیلے ہوئے ہیں، سو سو کوس تک ایک ایک سردار کی ہمارے سرحد ہے، ہم اپنی سرحد میں اپنی اسامی کا کام تمام کر دیتے ہیں، مسافر جہاں سے چلتا ہے جہاں جاتا ہے ہمارے آدمی اس کے ساتھ ہوتے ہیں، اگر لوٹ مار کا موقع نہیں ملتا تو دوسرے حد والے کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں جیسی اسامی ویسا مول بعض اسامی لاکھ روپے کو بک جاتی ہے بعض

ٹھگ قصبہ اور شہروں کی سراؤں میں جاکر حلوہ فروشی کرتے ہیں۔ سرا کی کوٹھڑی میں جاکر زہر کا حلوہ کھلاتے ہیں، وہ کھٹکا نہیں کھاتا ہے، فوراً مرجاتا ہے اور ہم مال لے کر چنپت ہوتے ہیں۔ بعض کی پاپچی کرتے ہیں۔ مسافر سوجاتا ہے اور ہم مال باندھ کر اور چھو ہوجاتے ہیں اور اسی طرح ہزاروں گھاتیں یاد ہیں۔ اکثر مسافروں کو تانت کی پھانسی دے کر مارتے ہیں۔ یہ مسافر راج محل سے چلا تھا راستہ والوں نے اسے مول نہ لیا، اُن کا شگون ٹھیک نہیں آیا اور یہ ہمارے ڈھب پر کہیں نہ چڑھا۔ دہلی پہونچ کر کمرہ پر داؤں لگا۔ ہم پانچ سو اشرفیاں کمر سے کھول کر چل دیئے۔ مگر بادشاہ کا اقبال ہمیں پکڑ لایا۔ چھ اشرفیاں ہم نے خرچ کی ہیں، باقی کوتوال صاحب کے پاس ہیں۔ چنانچہ کوتوال صاحب نے وہ اشرفیاں تانت کی پھانسیاں۔ کھنگ۔ جن میں لگا تھا۔ دھتورہ کے بیج جو گٹھڑیوں میں پائے گئے۔ حضور والا کو دکھائے۔ حضور والا نے حکم دیا کہ مقدمہ دارالقضا میں پہنچایا جائے اور مفتی صاحب فتویٰ دے کر حکم مناسب تجویز کریں۔ بعض امور اس کے مخفی رکھے جائیں۔

اورنگ زیب صاحب پنجاب کا دورہ کرتے کرتے کنجاہ کے قریب خیمہ زن ہوئے تو مخبر نے خبر دی کہ اس قصبہ میں ایک مولوی محمد اکرم بڑے بزرگ رہتے ہیں، بڑے پیر صاحب کے بڑے معتقد ہیں۔ جب اُن کے سامنے حضرت کا کوئی نام لیتا ہے تو وہ فوراً

سجدے میں گر پڑتے ہیں۔ فارسی کے شاعر بھی بہت اچھے ہیں غنیمت تخلص ہے
ایک مثنوی عشقیہ نہایت شستہ لکھی ہے۔ اس میں پنجاب کی تعریف کرتے ہیں ؎

چہ پنجاب انتخاب ہفت کشور　　قسم خوردہ بہ پنجابش آب کوثر

بادشاہ سلامت با شرع آدمی ہیں صوفیوں کے نام سے نفرت رکھتے ہیں مولانا
غنیمت کا حال سنکر جھلا گئے فرمایا کہ یہ شخص بڑا بدعتی معلوم ہوتا ہے اگر
تو اس کا سر کٹوا دوں گا غیر خدا کو سجدہ حرام ہے۔ اچھا کل دن کو انہیں حاضر کیا
جائے اگر فی الواقع بے گناہ اس پر ثابت ہو جائے تو اسے سزا دی جائے۔ چنانچہ دربار
گرم ہوا آپ جانتے ہیں مغل بادشاہوں کا دربار کس دھوم دھام سے ہوتا تھا۔
جس کی تیاری کو دیکھ کر بڑے بڑے بادشاہوں کے ایلچی اور سفرا غش کھا کر
گر پڑتے تھے۔ شہنشاہ تخت پر رونق بخش تھے اور تمام امیر و زیر پیکر تصویر بنے
حاضر تھے۔ مگر نقیبوں کی آواز آ رہی تھی جو مولانا غنیمت داخل دربار ہوئے بادشاہ
سلامت کو چونکہ ان سے بات چیت کرنی مد نظر تھی اس لئے اشارہ کیا گیا کہ تخت
خلافت کے پاس لاؤ۔ مولانا تخت کے قریب گئے تو بادشاہ نے ارشاد کیا بندگان
بارگاہ کے سمع اقدس تک خبر پہنچی ہے کہ اگر آپ کے سامنے کوئی شخص شیخ عبدالقادر
صاحب جیلانی کا نام لیتا ہو تو آپ سجدے میں گر پڑتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ
ہی بادشاہ سلامت نے دیکھا کہ مولانا غنیمت سجدے میں سر رکھے ہوئے ہیں۔
اس حال کو دیکھ کر اور تنگ تر ہو گئے اور مولانا کی طرف سے خیال بدل گیا۔

فرمایا کہ "مولانا کرسی پر بیٹھ جایئے"۔ مولانا کرسی پر بیٹھ گئے تو اورنگ زیب نے کہا
میں نے چاہا تھا کہ اس بدعت پر آپ کو قتل کروا دوں مگر آپ کے خلوص نے آپ کو
بچا لیا۔ آپ بڑے راسخ العقیدہ آدمی ہیں۔ آفریں ہے آپ کو۔ اور باعزاز آپ
کو رخصت کیا اور چلتے وقت بہت سی تصوف کی باتیں کیں اور جواب سنکر بہت
خوش ہوئے۔

اورنگ زیب قرآن و حدیث میں ملّا احمد صاحب عرف ملّا جیون صاحب کے
شاگرد تھے۔ ملّا صاحب امیٹھی کے رہنے والے تھے اور مزار بھی آپ کا امیٹھی ہی میں ہے
جو لکھنؤ سے چند میل کے فاصلے پر ہے مگر مدرسہ آپ کا جونپور میں تھا۔ جب
اورنگ زیب کا دربار سلطنت میں عدیم الفرصت ہو گئے تو ملّا صاحب کو لکھا کہ میں
جونپور آنے سے قاصر ہوں اور اشتیاق زیارت بہت کچھ ہے آپ دہلی قدم رنجہ
فرمائیں۔ اس ناچیز پر بڑا کرم ہوگا۔ ملّا صاحب نے لکھا میں عنقریب دہلی پہونچونگا۔
مگر انتظار کی حد گزر گئی تو بادشاہ نے پھر خط لکھا کہ حضرت نے وعدہ پورا نہ فرمایا
تو ملّا صاحب نے جواب میں لکھا کہ میں جونپور سے چلکر دلی پہونچ گیا تھا۔ جمنا کے
پل پر ایک خالی گاڑی مل گئی اور وہ جونپور جاتی تھی۔ آدھے کرایہ پر جونپور سے
جانے پر اس کا مالک راضی ہو گیا کرایہ سستا پا کر جونپور چلا آیا۔ مگر اب انشاء اللہ
تعالیٰ ضرور دلّی آؤنگا۔ اور ملّا صاحب دلّی پہنچے اورنگ زیب نے کئی میل سے
سے استقبال کیا اور قلعہ میں لا کر اتارا۔ ملّا صاحب نے [illegible] اورنگ زیب کو

سوغات ہیں دے کر فرمایا اس کے ہر تار کو والدہ نے کلمۂ طیبہ پڑھ پڑھ کر کاتا ہے
پھر اس کے سوت کو درود پڑھ پڑھ کر اٹیرا ہے۔ درود پڑھ پڑھ کر اس کی انٹیاں
بنائی ہیں، حلال کی کمائی کی بُنائی دی ہے۔ اس وقت یہ تیار ہوا ہے۔ اورنگ
زیب نے تھان کو آنکھوں سے لگایا چوما سر پر رکھا اور توشک خانہ کے داروغہ
کے سپرد کیا۔ پھر ملا صاحب نے ایک ہانڈی پیش کی اور اورنگ زیب کو دی جس میں
گلگلے تھے، فرمایا والدہ صاحبہ کا تبرک ہے تیل اور گڑ اور آٹا ان گلگلوں کا چرخہ
کات کات کر حلال کمائی سے منگایا ہے اورنگ زیب نے گلگلے بھی بہت خوشی
سے لئے اور نوکر کو حکم دیا کہ گلگلے خاصہ میں لگائے جائیں، چنانچہ دن کے بارہ
بجے دسترخوان پر گلگلے حضور والا کے لئے رکھے گئے ملا صاحب حضور والا کے
پاس ہی دسترخوان پر تھے حضور والا نے گلگلے کا ایک نوالہ توڑ کر منہ میں رکھا
اس میں سے ایک تار نکلا، بادشاہ نے نوالہ منہ میں رکھا تو معلوم ہوا کہ گلگلے میں
کچے ہیں تاب نہ ہوئی ابکائی آئی خدمتگار نے اگالدان پیش کیا۔ حضور والا نے
منہ کا نوالہ تھوک دیا۔ کلی کی، ملا صاحب اس حال کو دیکھ کر سخت ناخوش ہوئے
فرمایا اورنگ زیب حرام کے لقمے کھا کھا کر تیرا دماغ بگڑ گیا ہے۔ حلال کی روزی
کھانے کی سہار نہیں رہی اور بہت سی صلواتیں بادشاہ کو سنائیں مگر بادشاہ
بالکل چپ رہے اُف نہ کی کھانے کے بعد اورنگ زیب نے کہا حضرت ملا صاحب
جب تک سونے کے کمرے میں روشنی نہیں ہوتی تو مجھے نیند نہیں آتی، تو وہ

قبر کی تاریکی کیسے بسر ہوگی۔ ملا صاحب نے فرمایا کہ اے اورنگ زیب تیرا یہ سوچ بالکل
بیجا ہے مگر جب تو زیر زمین جائے گا تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ جس دن سے
محمد الرسول اللہ نے قبر میں آرام فرمایا ہے زمین کا اندرونی طبقہ روشن ہو گیا
ہے اور جگمگ جگمگ کر رہا ہے مزے سے پاؤں پھیلا کر سونا۔

اورنگ زیب نے حکم دیدیا تھا کہ کسی مدرسہ یا مکتب میں خواجہ حافظ شیراز
رحمۃ اللہ کا دیوان بطور درس کے نہ پڑھایا جائے کیونکہ لڑکوں کی سمجھ اس کتاب
کی باریکیوں کو نہیں پہنچ سکتی ہے اور معمولی استعداد کے استاد اسے پڑھا
نہیں سکتے ہیں مگر خود بدولت دیوان حافظ کے اسقدر معتقد تھے کہ رات
کو سوتے وقت تکیہ ان کے جزدان میں دیوان حافظ اپنے سرہانے رکھوا لیا کرتے
تھے اور فرمایا کرتے تھے عجیب با برکت کتاب ہے، مجھے ہر شب اس سے بہت
فائدے روحانی حاصل ہوتے ہیں۔

اورنگ زیب عالمگیر سنبھل مراد آباد کے علاقہ میں کسی گاؤں کے پاس خیمہ
زن تھے جو گاؤں کے قاضی صاحب کا چپراسی بادشاہ کے نام سمن لے کر بارگاہ
پر آیا۔ بادشاہ نے چپراسی کو بارگاہ پر بلا کر اپنے ہاتھ سے سمن لے کر پڑھا۔ لکھا
تھا چونکہ گاؤں [illegible] کا چودھری آپ پر ایک ہزار روپیہ بتاتا ہے لہذا کل دن
کے دس بجے حاضر عدالت ہو کر جوابدہی کرو۔ دوسرے دن وقت مقررہ سے دو
گھنٹہ پہلے گاؤں کی کچہری میں بادشاہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ قاضی صاحب اپنے کھیت

کو جوتنے کیلئے ہل بیل لے کر جنگل کو گئے ہیں، کچھ دیر بعد قاضی صاحب ہل اپنے کندھے پر رکھے بیل ہنکاتے آتے اور بادشاہ کو دیکھا تلوار ہاتھ میں لئے حاضر ہیں۔ قاضی صاحب اپنے زنانہ مکان میں گئے، نہا دھو عدالت کا لباس پہن شمشیر خاراشگاف ہاتھ میں لئے آتے اور سلام سنت الاسلام کے بعد مسند قضا پر بیٹھ کر فرمانے لگے۔

قاضی صاحب: "چپراسی یہ اورنگ زیب مدعا علیہ عدالت محمدی میں خلاف ضابطہ تلوار لے کر آیا ہے تلوار اسکے ہاتھ سے لے لو۔"

اورنگ زیب نے فوراً تلوار زمین پر رکھدی اور چپراسی نے اٹھالی۔

مدعی کا دعویٰ تھا کہ جب بادشاہ سلامت بادشاہزادے تھے تو شکار کھیلنے اس نواح میں تشریف لاتے تھے، اور کسی ضرورت سے ہزار روپیہ مجھ سے لئے تھے اور فرمایا تھا ڈیرہ پہ پہنچکر بھجوا دونگا مگر دس برس ہوگئے آتے، وہ روپے مجھے نہ ملے اب جو حضور ادھر آئے تو میں نے داد خواہی کی۔

اورنگ زیب: "مدعی سچا ہے، میں بھول گیا تھا میں معافی چاہتا ہوں، یہ ہزار روپیہ حاضر ہے۔"

عدالت نے مدعی کو دلوا دیے، مدعی اپنا روپیہ لے کر چلدیا کچہری برخاست ہوئی اور قاضی صاحب اور بادشاہ رہ گئے۔

بادشاہ سلامت: "کیوں قاضی صاحب آپ ہر روز عدالت میں تلوار لیکر

آئے ہیں؟"

"قاضی صاحب! نہیں بلکہ آج تمہارے دھمکانے کیلئے کہ بادشاہت کا گھمنڈ عدالت میں نہ کرو، مگر تم تلوار عدالت میں لے کر کیوں آئے تھے؟"

اورنگ زیب "اس لئے کہ اگر تم میرے دُرست مقدمہ ٹھیک ٹھیک نہ کرو تو تلوار سے تمہارا سر کاٹ لیا جائے۔"

شاہجہاں بادشاہ کی ماں جودھ بائی اودے سنگھ مارواڑ کے راجہ کی بیٹی تھی، اس راجہ کو راجہ موٹے کہتے تھے۔ جودھ بائی کا دوسرا نام جگت گسائنی تھا۔ اس بہو کو اکبر اعظم بڑی دھوم سے بیاہ کر لایا تھا اور جہانگیر کا گھر بسایا تھا۔ تیرا تیزی کی چاند رات ۲۸ [illegible]ھ کو جودھ بائی نے فتح پور سیکری میں انتقال کیا، جہانگیر کو اس رانی کے مرنے کا بڑا صدمہ ہوا شاہجہاں کی عمر اس وقت اٹھائیس سال تھی۔

جب شاہجہاں نے تخت پر قدم رکھا تو سجدہ تعظیمی جو بادشاہ کو نوکر کیا کرتے تھے موقوف کر کے صرف رسم زمین بوسی جائز رکھی، مگر اس میں بھی دونوں ہاتھ ٹیکانے سے سجدہ کا انداز نکلتا تھا۔ اسے بھی ناجائز قرار دیا، اور تسلیم چہار رسم کو مقرر فرمایا، اور حکم دیا کہ سادات اور مشائخ کہ خود واجب التعظیم ہیں، دربار میں آئیں تو السلام علیکم کہیں۔ اور جائیں تو فاتحہ پڑھیں۔

جلال الدین اکبر کے فیلخانے میں قلم بند چھ ہزار ہاتھی تھے مگر سفید ہاتھی کی ہمیشہ جستجو رہتی تھی، سفید ہاتھی نہ ملنا تھا نہ ملا، شاہجہاں کو یہ تحفہ جیون خاں نے دی جس کی روایت یہ ہے کہ خواجہ نظام الدین ہاتھیوں کا سوداگر جب پیگو بندر میں پہنچا تو اس نے ایک شخص کے پاس دُبلا پتلا ہاتھی کا ایک بچہ دیکھا جو نہایت ہی ذلیل اور بیمار تھا اور اس کے بدن کی کھال راکھ جیسی تھی، خواجہ نظام الدین نے وہ ہاتھی کا بچہ مول لے لیا اور اُسے ہندوستان میں لے آیا، ہر برس میں اس کی کھال نکھرتی تھی، بارہ برس میں وہ بالکل سفید اُجلا بن گیا، دلیر خاں جس کی جاگیر میں رہتا تھا جب اسے خبر لگی تو اس نے وہ ہاتھی خواجہ کو بہت سی قیمت دیکر مول لے لیا اور سجا کر شاہجہاں کے سامنے پیش کیا، بادشاہ سفید ہاتھی دیکھ کر شاد ہو گیا۔ ہاتھی شاہی فیلخانے میں پہونچا دیا گیا اور دلیر خاں نے بڑا انعام پایا۔

شاہجہاں نے مغل دربار کے سید اور بخارا کے سید اور ہندوستان کے شیخ زادے جو منصب دار تھے، ان میں سے دو سو نفر کو چھانٹ کر حکم دیا کہ ہماری سواری کے جلو میں ہوا کرو اسی وجہ سے یہ لوگ جلودار کہلاتے۔ اور سو منصب دار مغل اور دو سو احدی جن کی بہادری کی بارہا آزمائش ہو چکی تھی۔ انہیں سونے چاندی کے گرز دے گئے تھے سواری کے وقت وہ شاہجہاں کے ہمرکاب رہتے تھے۔ اور

سواری کے وقت کے علاوہ گرز لے کر سراپردہ شاہی کے دروازے پہ رہتے تھے، وہ گرز بردار کہلاتے تھے۔

شاہجہاں کی عمر پندرہ سال دو مہینے چودہ روز کی تھی، تو اس کی شادی ممتاز زمانی بیگم سے ہوئی۔ پانچ برس منگنی رہی تھی۔ نکاح کے وقت اس بیگم کی عمر ۱۹ برس کچھ مہینوں کی تھی، پانچ لاکھ مہر بندھا۔ اس شادی سے پہلے شاہجہاں کا مظفر حسین مرزا کی دختر سے نکاح ہوا تھا اور اس بیگم کے پیٹ سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام پرہیز بانو رکھا گیا۔ ممتاز محل سے نکاح سے پانچ برس بعد شاہجہاں کا نکاح ۲ رمضان کو عبدالرحیم خاں خانخاناں کی بیٹی سے مصلحتاً کیا گیا۔ اس بیوی کے پیٹ سے ایک لڑکا آگرہ میں پیدا ہوا جو ایک برس نو مہینے کا ہو کر مر گیا، جہاں افروز نام تھا۔

ممتاز محل کی کوکھ سے بیس برس میں آٹھ لڑکے اور چھ لڑکیاں اس تفصیل سے پیدا ہوئے۔

نام بچہ	سنہ پیدائش
حورالنسا بیگم	۸ ماہ صفر ۱۰۲۲ھ ہجری
جہاں آرا بیگم	۲۱ ماہ صفر ۱۰۲۳ھ ہجری
دارا شکوہ	۲۹ صفر ۱۰۲۴ھ ہجری

نام بچہ	سنہ پیدائش
شاہ شجاع ۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔	۱۸ ر جمادی الآخر ۱۰۲۵ء ہجری
روشن آرا بیگم ۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔	۲ ر رمضان ۱۰۲۶ء ہجری
اورنگ زیب ۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔	۱۵ ر ذیقعدہ ۱۰۲۷ء ہجری
اُمید بخش ۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔	۱۱ ر محرم ۱۰۲۹ء ہجری
ثریا بانو بیگم ۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔	۲ ر رجب ۱۰۳۰ء ہجری
لڑکا نام رکھنے سے پہلے مر گیا ۔ ۔۔ ۔۔	۱۰۳۲ء ہجری
مُراد بخش ۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔	۲۵ ر ذی الحجہ ۱۰۳۳ء ہجری
لطف اللہ ۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔	۱۲ ر صفر ۱۰۳۶ء ہجری
مرزا دولت افزا ۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔	۴ ر رمضان ۱۰۳۷ء ہجری
حُسن آرا بیگم ۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔	۱۰ ر رمضان ۱۰۳۹ء ہجری
گوہر آرا بیگم ۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔	۱۰۴۰ء ہجری

اِس لڑکی کے پیدا ہونیکے صدمہ سے ممتاز محل فوت ہوگئیں۔

شاہجہان بادشاہ خاص خاص فرمانوں اور خاص کاغذوں کی پیشانی پر صندل کے عرق سے اپنے سیدھے ہاتھ کے پنجہ کو چھاپ دیتے تھے اور اس سے شاہنشاہ کی سچی نشانی معلوم ہوتی تھی۔ عہدناموں پر ضرور چھاپا لگایا جاتا تھا کہ طرف ثانی

پورا پورا یقین کرے کہ یہ بادشاہ سلامت نے خود قول وقسم کیا ہے جس کی گنجائش نہیں۔ اُس وقت کیا خبر تھی کہ انیسویں صدی میں قدرت الٰہی کا یہ بھید کھلے گا کہ ہر انسان کے ہاتھ کے انگوٹھے کا نشان جدا جدا ہوگا، اور لاکھ کروڑ میں کسی آدمی کے انگوٹھے کی لکیروں سے شناخت ہو جائیگا۔ اور دستاویزوں اور تمسکوں پر بجائے مہر کے لگایا جائے گا۔

شاہجہاں آباد میں اونچے گھرانوں کے اندر یہ رسم بہت پرانی چلی آتی ہے کہ جب لڑکے کی پیدائش کا خط دادا یا نانا یا کسی اور عزیز کے نام بھیجا جاتا تھا تو بچہ کا پنجہ سیدھے ہاتھ کا خط پیشانی پر صندل سے نشان چھاپ دیا جاتا تھا تاکہ مکتوب الیہ اُسے دیکھکر شاد ہوں۔

شاہجہاں کے زمانہ سلطنت میں اقلیم ہندوستان وغیرہ کی کل آمدنی ۲۲ کروڑ اس تفصیل سے روپیہ کی جمع میں تھی۔

نام صوبہ	جمع نقد روپیہ کی صوبجات میں
صوبہ شاہجہاں آباد	ڈھائی کروڑ۔
صوبہ اکبر آباد	سوا دو کروڑ۔
صوبہ لاہور	سوا دو کروڑ۔
صوبہ اجمیر شریف	ڈیڑھ کروڑ۔

نام صوبہ	جمع نقد روپیہ کی صوبجات میں
دولت آباد	ایک کروڑ ۳۷ لاکھ ۵۰ ہزار
صوبہ برار	ایک کروڑ ۳۵ لاکھ ۵۰ ہزار
احمد آباد شریف	ایک کروڑ ۳۳ لاکھ ۵۰ ہزار
صوبہ بنگالہ	ایک کروڑ ۳۵ لاکھ
صوبہ الہ آباد	ایک کروڑ
صوبہ بہار	ایک کروڑ
صوبہ مالوہ	ایک کروڑ
صوبہ اودھ	پچھتر لاکھ
صوبہ تلنگانہ	پچھتر لاکھ
صوبہ خاندیس	ایک کروڑ
صوبہ ملتان	ستر لاکھ
صوبہ اڑیسہ	پچاس لاکھ
صوبہ سندھ	بیس لاکھ
صوبہ بگلانہ	پانچ لاکھ
صوبہ کاشمیر	۳۷ لاکھ ۵۰ ہزار
کابل	چالیس لاکھ

MUSLIM UNIVERSITY

جمع نقد روپیہ کی صوبجات میں

نام صوبہ

بلخ .. .. بیس لاکھ
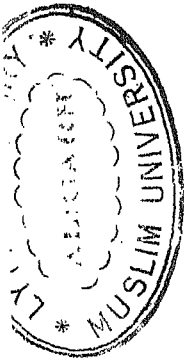
قندھار .. .. پندرہ لاکھ

بدخشاں .. .. دس لاکھ

میزان کل بائیس کروڑ

پڑا فلک کو کبھی دل جلوں سے کام نہیں
جو آگ میں نہ لگا دوں تو داغ نام نہیں

جمادی الآخر سنہ ۱۰۵۴ھ ستراہواں سال شاہجہان کے جلوس کا دھوم دھام سے ختم ہوا تو جہاں آرا بیگم صاحبہ جنہیں بادشاہ بیگم بھی کہتے تھے، اُنکی سالگرہ کا جشن شروع ہوا۔ لال قلعہ میں محلسرا سے لے کر دیوانِ عام دیوانِ خاص تک رات کے وقت جھاڑ فانوس کنول دغدغوں کی روشنی تھی، شمع چربی مومی بتیاں جل رہی تھیں۔ موقع موقع سے فیتل سوز، چاندی سونے کے کھوپرے اور زیتون کے تیل کی روئی کی موٹی موٹی فیتلوں کی روشنی سے جگمگا رہے تھے۔ لال قلعہ کے لاہوری دروازے سے شہر پناہ کے لاہوری دروازے تک اور لال قلعہ کے دہلی دروازے سے شہر پناہ کے دلی دروازے تک اور تمام خاص بازاروں میں، جامع مسجد کی سیڑھیوں تک دو طرفہ ٹھاٹر بندی تھی اور اُن میں کڑوے تیل کے چراغ جل رہے تھے اور رات کا دن ہو گیا تھا۔ جہاں آرا بیگم کو صدر دالان

میں محل کی مشاطہ دُلہن بنا رہی تھیں۔ لباس ہزاروں کا تھا تو زیور لاکھوں کا۔ صدر دالان کے سامنے صحن چبوترے کے نیچے دُور تک انگنائی میں دری چاندنی کا فرش تھا، اور فرش پر رستہ بیچ کا چھوڑ کر دو رویہ قطار مردنگیوں کی تھی۔ مردنگیاں بلور کی بھی تھیں، اور سفید کانچ کی بھی، سب میں شمع روشن تھیں، جب گھر عورتوں نے اچھی طرح بیگم کو بنا سنوار دیا تو خاندان کی بڑی بُوڑھیاں اُنہیں پکڑ کر بسم اللہ بسم اللہ کرتی ہوئی انگنائی میں پہنچا نے چلیں جہاں فولادی ترازو کھڑی تھی۔ ٹک کے دونوں پلڑوں میں مخملی تکیے رکھے ہوئے تھے، پاس ہی سونے چاندی کی اینٹوں کا ڈھیر لگ رہا تھا۔ تاکہ بیگم کو ایک بار سونے کے برابر اور ایکبار چاندی کے برابر ہوزن تول کر وہ منوں سونا اور منوں چاندی خیرات کر دی جائے، ادنیٰ اعلیٰ عورتوں سے صحن کھچا کھچ بھر رہا تھا، اور سب کی نگاہ بیگم کی طرف تھی، بیگم کے پاؤں میں گھیتلی جوتی تھی جس کا تلا بہت چکنا تھا۔ صحن چبوترے کی سیڑھی سے اُترنے میں پاؤں پھسلا، مگر پکڑنے والیوں نے بیگم کو سنبھال لیا، اُس پر بھی بیگم لپٹے سیدھے ہاتھ کو جھٹکا لگا اور جھٹکنے کے ساتھ دوپٹہ کا آنچل بال بھر اُس شمع پر گرا جو سیڑھی کے پاس مردنگی میں کھڑی جل رہی تھی، دوپٹہ بہت ہلکی ٹک کا تھا۔ آنچل نے آگ لی اور دوپٹہ بھُر بھُر ہوتا ہوتا ہوا شعلہ کی سر اور چوٹی تک لے پہنچا، اور بیگم نے عورتوں سے کہا۔ خدا کیلئے مجھے چھوڑ دو، وہ بہری چل گئی سنبھالنے والیاں تھم

بیگم کو چھوڑا تو آگ قمیص کے گریبان کو پہونچ کر سینہ تک پہنچی اور سینہ کو جلا کر شلوار میں پہنچ گئی۔ بیگم تڑپ کر فرش پر گر پڑیں اور حویلی میں شور قیامت برپا ہوا۔ ہزاروں عورتیں بیگم کے کپڑوں کی آگ بجھاتی تھیں مگر آگ نہ بجھتی تھی۔ بیگم کی چار وفادار لونڈیوں نے نمک کا حق ادا کیا، بیگم کو لپٹ کر آگ بجھا دی، مگر بیگم کے کپڑوں کی آگ اُن کے کپڑوں میں لگی۔ دونوں آگ کی جلن کی تاب نہ لائیں اور قربانت شوم کہتی ہوئی اپنی بیگم پر سے نثار ہو گئیں۔ حضرت بادشاہ اور خواجہ سرا عورتوں کے غل کو سن کر محل میں آئے اور بیگم اور دو پرستاروں کو زمین پر تڑپتے اور دو لونڈیوں کو مردہ پایا۔ بہزار دقت بیگم کو پلنگڑی پر ڈالا، کمرے میں پہنچایا۔ بیگم برابر ہائے جلی ہائے جلی کہے جاتی تھیں۔ طبیبوں اور حکیموں، ویدوں، جراحوں، معالجوں سے محل بھر گیا۔ یوں تو بقول حضرت شادؔ

کیا دل کو داغوں سے سرو چراغاں ۔۔۔ کبھی تم نے آکر تماشہ نہ دیکھا

بیگم سر سے پاؤں تک جلی تھیں، مگر آگ نے سینہ اور پیٹ کو بھرتہ کر دیا تھا۔ یہ کیا لکھا جائے کہ بیگم کے آبلوں اور پھپھولوں پر چارہ گروں نے کیا کیا۔ کیا دوائیں لگائیں، تقویت روح و قلب کے واسطے کیا کیا عرق پلائے۔ نقد و جنس خیراتیں اور تصدق بٹنے لگے۔ بادشاہ کی آنکھوں سے آنسو دریا کی طرح رواں مگر منہ سے اُف نہ کرتے تھے کہ زخمی بیٹی زیادہ گھبرائے گی۔ بیگم کی سگی بہنیں زار و قطار روتی تھیں اور کہتی تھیں، آپ کو نظر لگ گئی۔ اس بار آپ سالگرہ کی دلہن بنی ایسی

بنی تھیں کہ جنت کی حوریں اور پرستان کی پریاں قربان کی تھیں، یہ منحوس خبر آناً فاناً سارے شہر میں اُڑ گئی، ساری رعایا ہاتھ ملنے لگی، جشن کی رات شب شہادت بن گئی۔ شاہجہاں نے منت مانی کہ جب بیگم صحت کریں گی اور سفر کے قابل اُن میں طاقت آجائے گی تو خواجہ غریب نواز کے آستانہ پر اجمیر شریف حاضر کروں گا۔

عیش و نشاط کی رات مصیبت کی پہاڑ بن گئی، اور صبح اپنا مرہم کافور لے کر بیگم کی مزاج پرسی کے لئے مشرق کے دارالشفا سے لال قلعہ میں حاضر ہوئی بادشاہ سلامت ابھی صبح کی نماز پڑھ کر مصلے سے اٹھے بھی نہ تھے جو خضر کے محلے سے ایک گمنام عرضی پہنچی کہ بیگم نے اپنی جاگیر کی بے گناہ رعایا پر بڑا ظلم توڑا ہے۔ اُن کی گرم آہیں شعلوں کے قالب میں ڈھل گئیں، جب آگ سے صدمہ پہنچایا کے دل ٹھنڈے نہ ہوں گے زخموں کی آگ نہ بجھے گی۔ بیگم کو پردہ اٹھا کر اپنے ایک خطاوار بندے کے پیچھے ہمیں کالا سانپ چھوڑ رکھا تھا جس نے اس خطاوار کو جا بجا کاٹا اور وہ مر گیا ہے۔

دوران بقا چو باد صحرا بگذشت — تلخی و خوشی و زشت و زیبا بگذشت
پنداشت ستمگر کہ جفا بر ما کرد — بر گردن او بماند و بر ما بگذشت

ہر چند کہ وہ خطاوار تھا مگر اس زہر کا سزاوار نہ تھا کہ سانپ سے اس کو ڈسوایا جاتا۔ ابھی تو دنیا کی آگ میں جلا یا ہے آگے قبر کے سانپ اور دوزخ کی آگ باقی ہے۔

اِس عبرتناک مضمون کو پڑھ کر بادشاہ نے ایک چیخ ماری اور وزیر کو بلا کر حکم دیا کہ ہماری قلمرو میں جتنے بھاری مجرم ہیں بندی خانوں سے آزاد کر دئے جائیں اور سات لاکھ روپیہ عین المال شاہی سے لے کر اُن پر تقسیم کر دیا جائے تاکہ وہ اپنی تلافی مافات کریں۔ اور اسی سات لاکھ کے علاوہ جو بیگم کے معالجہ اور اُن کے اوپر سے صدقہ چیلے میں روپیہ صرف ہوا اسکی تفصیل میں آگے لکھونگا اب تو میں یہ لکھتا ہوں کہ کسی طبیب یا حکیم کے علاج سے بیگم کو تندرستی نصیب نہ ہوئی تو بادشاہ نے فرمایا کہ شہر سورت سے فرنگی حکیم بلایا جائے۔ بندر سورۃ سے شاہجہاں آباد تک ڈاک لگائی جائے اور وہ پینس میں سوار ہو کر جلد آئے۔ چنانچہ ڈاکٹر فرنگی آیا، اور اُس نے علاج کیا۔ لاکھو روپے سے اُوپر اُوپر لے کر چلتا ہوا، اور بیگم بدستور بستر مرض پر پڑی رہیں، اور اسی طرح چھ سات مہینے کٹ گئے۔ طبیب باشی برابر یہی کہے جاتے تھے کہ مریضہ کی جانبری مشکل سے ہوگی۔ کیوں کہ خون پیپ بن کر پاؤں سے نکلا جاتا ہے۔ بادشاہ دو دوپہر برابر جانماز پر بیٹھ کر اپنی لڑکی کی شفا کے لئے دعا کرتے تھے، ایک روز عارف نام بیگم کے چیلے نے بادشاہ کے حضور میں عرض کی کہ فدوی کو جلے ہوئے کے لئے ایک مرہم آتا ہے، آپ لگا کر مریض اچھا ہو جاتا ہے۔ فدوی کے ہزار بار سے کم تجربے میں نہیں آیا ہے، کبھی خطا نہیں کی، بادشاہ علاج کرتے کرتے تنگ ہو گئے، مرتا کیا نہ کرتا۔ حکم دیا کہ فوراً بناؤ۔ مرہم تیار ہوا اور بیگم کے زخموں پر لگایا

گیا، اور زخم اچھے ہونے شروع ہوتے، اور زندگی کی توقع پیدا ہونے لگی۔

بیگم کچھ چلنے پھرنے لگیں، جشن سالگرہ کی دوبارہ تیاری کی گئی، اور عارف چہلہ کو چاندی میں تولا، خلعت اور انعام الگ دیا۔ کہ مدینہ جو زرنقد اسی غرض سے بھیجا گیا، اس کے علاوہ بیس لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔ بیگم داود کو ایک مہر اور ایک روپیہ، پانچ سو تولے سونے اور چاندی مع خلعت اور منصب دو ہزاری دو سوار اسپ فیل ملے۔ حکیم مومنا دوسرے چارہ گر کو تیس ہزار روپیہ سالانہ اور منصب دو صد سوار اسپ فیل عطا ہوا، اور انعام فقرا حکما امرا اور ارباب طرب فیض یاب ہوتے، چار لاکھ شریفیا تکے اور ایک لاکھ روپیہ حرمین کے متحوبا کے لئے احمد سعید مشہد کے ہاتھ بھیجا گیا۔ بادشاہ اور بیگمات نے بادشاہ زادی صاحبہ کے سر پر سے خود کھڑے ہو کر جواہر اور سونے چاندی کے پھول نچھاور کئے۔ دوسرے دن بیگم بادشاہ کی خدمت میں تسلیم کے لئے حاضر ہوئیں تو حضور والا نے اُن کی کلائی میں ایک سو تیس موتیوں کی سمرن اپنے ہاتھ سے باندھ کر دُعا دی۔

پھر بہار آئی چمن میں زخم گل لے ہوئے | پھر مرے داغ جنوں تا نقش پا لے ہوئے

جہاں پناہ نے چاہا کہ بیگم کی منت پوری کرنے کے واسطے اجمیر شریف لے جائیں اس لئے شاہجہاں آباد سے روانہ ہو کر اکبر آباد تک پہنچے تھے کہ بیگم

کے سپھر سے پھر سے گھاؤ کا انگور پھٹ گیا اور حکما نے کہا ابھی سفر اجمیر کا ملتوی کیا جائے ورنہ اندیشہ ہے کہ راستہ کی تکان سے حرارت پیدا ہوکر ہلاکت کا باعث ہو، اس لحاظ سے جمنا میں کشتیوں سے شاہجہاں کی واپسی ہوئی، آگرہ سے متھرا چار دن میں بجرے پہونچے، متھرا کے فوجدار نے حاضر ہوکر شہنشاہ کی خدمت میں گذارش کی کہ اس شہر میں مامون نام ایک بے نوا فقیر رہتا ہے، وہ یہ کہتا ہو چار گھڑی میں ایک مرہم بنا کر دونگا بیگم کے زخموں پر لگایا جائے، اگر ایک ہفتواڑے میں زخموں کا نام رہ جائے تو چور کا حال وہ میرا حال۔ بادشاہ نے فرمایا اچھا۔

مامون مع مرہم کے دہلی حاضر ہوا، اور دہلی پہونچکر اس کا علاج کیا گیا اور تین دن میں زخم اور ناسور اچھے ہوکر خاک سے اڑ گئے اور تیسرا جشن صحت کا پھر لاکھوں روپے کے خرچ سے ہونے لگا۔ مامون کو سونے چاندی میں تلوا دیا، اور اسباب طرب دیکر اسے نہال کردیا، بیگم ہنسی خوشی اجمیر گئیں اور منت پوری ہوئی۔

جواب کا ہے کو تھا لاجواب تھی دہلی   مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دہلی

ایک روز امیر تیمور صاحبقران اپنے مرکب پر سوار دارالسلطنت بخارا کی گلی کوچوں میں چکر لگا رہا تھا، چوبدار رکاب تھامے ساتھ تھا، اور امیر پوچھتا جاتا تھا کہ اس گلی کا کیا نام ہے؟ اور اس کوچے کو کیا کہتے ہیں؟ یہ کون سا محلہ ہے؟

جمعدار جواب دیتا تھا یہ پستہ شکن محلہ ہے، یہ مرچوں کی گلی کہلاتی ہے یہ کوچہ روشن آباد ہے، جو چلتے چلتے ایک تنگ کوچہ میں پہنچا، اور اس نے یہ دیکھا کہ بانسوں کے پھاٹک کے آگے چند نوجوان ایک دری کے فرش کو چاروں طرف سے پکڑے جھاڑ رہے ہیں اور دھول اڑ رہی ہے، امیر نے پوچھا جمعدار یہ کیا جگہ ہے؟ جمعدار نے کہا حضور یہ کوچہ حضرت خواجہ سید بہاء الدین نقشبندؒ کا ہے اور بانسوں کے پھاٹک والی آپکی خانقاہ ہے۔ اس میں آپ تشریف فرما ہیں مرید خانقاہ کی شطرنجی کو جھاڑ رہے ہیں۔ امیر کو دیکھ کر نوجوانوں نے شطرنجی جھاڑنے سے اپنے ہاتھ روک لئے تھے، اور امیر ان لوگوں کے پاس پہنچ گیا تھا۔

امیر نے نوجوانوں سے کہا "تم ہمارا اصلاً لحاظ نہ کرو شطرنجی بدستور جھاڑے جاؤ۔"

آپ جانتے ہیں مرید اور طالب علم الھڑ ہوتے ہیں، نوجوانوں نے دری کو اس زور سے پٹخا کہ دھول کے مارے امیر کا سازو یراق اور امیر کا چہرہ، تاج گھوڑا وغیرہ سب اٹ گئے، امیر نے اڑتی ہوئی دھول کو دونوں ہاتھوں سے اپنے منہ پر مل کر کہا "غبار المدینہ الشفا" اور گھوڑے کو پھیر کیا، اور چلا گیا، مریدوں نے سارا حال حضرت کی خدمت میں عرض کیا۔

حضرت خواجہ سید بہاء الدین نقشبندی نے کہا "لڑکو یہ کیا کہتے ہو کہ امیر تیمور ہماری درگاہ کی خاک منہ پر مل گیا، یہ کیوں نہیں کہتے کہ امیر اپنی عاقبت

سنوار گیا۔ الٰہی اُس تک پہنچنے جس طرح تیرے رسول کی زیارت کا ادب کیا ہے
اسی طرح اس کے بدلے میں اُس کا نام شرق سے غرب تک شمال سے جنوب تک
روشن کر دے، اس کی اولاد در اولاد پشتوں تک سلطنت بخش دے۔ چنانچہ
امیر تیمور سے میران شاہ، سلطان ابوسعید، مرزا سلطان محمد، مرزا عمر شیخ، مرزا
بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہان تک گیارہویں سلطنت آئی، شاہجہاں کو تعمیر
کا دلی شوق تھا، نئی دلی بسانے کی تدبیر شروع کی، لال قلعہ اور اس کی اندرونی
عمارتوں اور جامع مسجد اور نئے شہر کے نقشے بنوائے گئے، شہنشاہ نقشوں میں
بذات خود اصلاح دیتے تھے، میر عمارت نے ہر مکان ہر محل کی لاگت کا تخمینہ
تیار کیا اور ملکوں ملکوں سے سنگ مرمر، سنگ سرخ، سنگ سیاہ، سنگ باری
اور ہزار ہا قسم کا مصالحہ اور سامان آنے لگا۔ میر عمارت نے چینیا اینٹ کا پیمانہ
ایک ٹھیکیدار کو دے کر کہا ایسی اینٹ تیار کرو مگر اینٹ کچی نہ رہے، لاکھوری ہو
بادشاہی کام ہے، دھیان سے کرنا۔ ٹھیکیدار نے کہا پیشگی تو دلوائیے۔ میر عمارت
نے لاکھ روپے کی چٹھی لکھ دی، خزانہ سے فوراً روپیہ پٹ گیا اور ٹھیکیدار کام
میں مشغول ہو گیا، اینٹوں کا پزاوہ چڑھ گیا۔ کچھ مدت کے بعد میر عمارت کے
پاس ٹھیکیدار بسورتا ہوا آیا اور کہنے لگا میں تو برباد ہو گیا، پزاوے کی آنچ تیز ہو گئی
اینٹوں کا کھنگر بن گیا۔ بادشاہ اس بندے کا [illegible] میں اپنا [illegible]
لیے میں کیا لگاتا ہوں، دیکھئے یہ کھنگر ہے۔

میر عمارت: گھبرانے کی کیا بات ہے اور قلم اٹھا کر انہوں نے ایک عرضی لکھ کر بادشاہ کے حضور میں بھیجی کہ لال قلعہ اور جو شاہی عمارتیں دریا کے کنارے بنائی جاتی ہیں ان کی بنیادوں میں بجائے سنگ و خارہ کے کھنگر بھرا جائے گا۔ کیونکہ کھنگر پانی کو خوب جذب کرتا ہے اور بنیاد مضبوط رہتی ہے اور بنیاد کی مضبوطی کے ساتھ اوپر کی عمارت کا مضبوط ہونا شرط ہے۔ کھنگر کا نمونہ ملاحظہ کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ لاگت اس پر دوگنی آتی ہے منظوری دی جائے۔ جواب آیا کھنگر کا بھروانا مناسب ہے۔ دوگنی لاگت منظور ہے۔ بدولت ہے۔ میر عمارت نے کہا ٹھیکیدار ایک لاکھ پہلے کھنگر کے نقصان کا پا لو اور اب لاکھ کے بدلے دو لاکھ لیتے رہو اور تم کھنگر بچاتے رہو۔ میر عمارت کی یہ عنایت اور بادشاہ کی یہ پرورش دیکھ کر ٹھیکیدار خوش ہو گیا اور دل سے کام کرنے لگا۔ جب لال قلعہ کی نیویں کھدنے لگیں تو بڑے بڑے لوہے کے کڑاہ اور تانبے کی ناندوں میں چربی کھولائی جاتی تھی اور پکیوں کی طرح اس میں کوری اینٹیں ڈالی جاتی تھیں اور اینٹیں جب خوب چربی پی لیتی تھیں تو نکال کر ٹھنڈی کی جاتی تھیں اور گچ کے ساتھ بنیاد میں رکھی جاتی تھیں۔ بیچ میں سفیدی ناریلوں کے پتھر کی، ماش کا آٹا، مردار سنگ، گوڑ، السی کا تیل سن مقرش ڈال کر ببول گری کا پانی چھان کر دیا جاتا تھا۔ یہ ادنیٰ قسم کا مصالحہ تھا اور بڑھیا مصالحوں کی تفصیل کے لئے دفتر درکار ہیں۔ سفیدی جو دیوار پر لگا کر گھوٹی جاتی تھی، وہ احمد آباد گجرات ایک قسم پہاڑ کی کان سے آتی تھی۔

اِس سفیدی کا یہ خاصہ تھا کہ جب اس کی گھٹائی کی جاتی تھی تو بالمبالغہ چمک دمک میں جلّی آئینہ بن جاتی تھی، اور اُس کے اندر آنکھوں کا سرمہ دکھائی دیتا تھا، دو سو برس تک آبدار رہتی تھی، لال قلعہ اُس کے اندرونی مکان، قصر و ایوان بن رہے تھے۔ تخت طاؤسی کے لئے جواہر تراشے جاتے تھے جنگل میں منگل تھا، ہزاروں مزدور، معمار، کاریگر خیموں میں، چھولداریوں میں، جھونپڑیوں میں پڑے رہتے تھے، دُور دُور کے پہاڑوں سے چھکڑوں میں پتھر لدے چلے آتے تھے۔ ایک چھکڑے میں سو سو پچاس پچاس بیل جوتے جاتے تھے۔ سنگتراشوں کی چھینیوں اور ٹانکیوں کی دھڑا دھڑ سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی، ہر سو قدم کے فاصلے پر ایک خیمہ خزانہ کا برپا تھا ایک ہندو خزانچی اور تین محرر دس سپاہی روپے کی حفاظت کے لئے حاضر رہتے تھے، روپیہ، اٹھنیاں، چونیاں دونیاں، پیسے اور کوڑیاں رکھی رہتی تھیں، کام امانی میں زیادہ اور ٹھیکہ میں کم ہوا کرتا تھا۔ شام کے چار بجے روزانہ چِٹھا بٹ جاتا تھا۔ غریبوں کا پیسہ پیسہ واجب الادا ہو جاتا تھا، لال قلعہ کے لاہوری دروازے سے شہر کے فرضی لاہوری دروازہ تک اُردو بازار ہٹیوں اور جھونپڑیوں کی دوکانوں میں لگا دیا گیا تھا جس میں جو، گیہوں، جوار، باجرہ کے آٹے سے لے کر قسم قسم کی جنس کپڑا، ترکاری، کابل و کشمیر کے میوے تک ملتے تھے آگرہ سے حکم پر حکم چلا آتا تھا کہ اُردو بازار میں ہر شے کی دوکانیں اضافہ ہوتی رہیں، تاکہ غیر ملکوں کے

کاریگر جو اپنا دیس چھوڑ کر پردیسی بنے ہیں وہ تکلیف نہ پائیں اور اپنے وطن کی اشیا اور غذا انہیں میسر ہو۔ شہر کا نقشہ بنا کر اس کے حصے حصے کر دیے گئے، اور شاہجہاں نے ان حصوں کو اپنی اولاد پر بانٹ دیا تھا، اور فرمایا کہ لاگت سب خزانے سے ملے گی، اپنے حصہ میں عمدہ عمدہ مکانات اور محل بنوالو تاکہ نیا شہر اچھی اچھی عمارتوں سے آراستہ ہو کر آبادی کی صورت پکڑے چنانچہ دکن کا حصہ اورنگزیب کے اہتمام سے زیبائش پانے لگا۔ کشمیری دروازہ کے قطع کو دارا شکوہ نے فلک شکوہ قصر و ایوان سے سنوارا، چاندنی چوک کے ٹکڑے کو جہاں آرا بیگم کے غلام نے جو ناتواں تخلص کرتا تھا، باغ اور گلشن اور حماموں سے رشکِ فردوس بنایا۔ نٹوں کا کوچہ اسی ناتواں کی یادگار رہ جاتا۔ جامع مسجد کی تعمیر نواب سعد اللہ خاں وزیر کو سپرد تھی اور اس کی نیویں بھری گئیں تھیں، وہ انجینیر جس کی سپردگی میں جامع مسجد کا نقشہ تھا یکایک مع نقشے کے غائب ہو گیا اور مسجد کی تعمیر کا کام اینڈ ہو کر رہ گیا۔ اس امر کی خبر پا کر شہنشاہ ناخوش ہوئے، حکم صادر فرمایا کہ جو شخص اس کافر نمک مسلمان کو جس نے خانہ خدا کی تیاری میں روڑا اٹکایا ہے پکڑ کر لائے گا اسے اس قدر انعام دیا جائے گا مگر وہ خدا کا بندہ ایسا غائب ہوا کہ تین برس تک کسی نے اس کی جھلک بھی نہ پائی۔ تین سال کے بعد وہ دربار شاہی میں حاضر ہوا۔ حضور والا نے فرمایا، کمبخت یہ حرکت کیا تھی؟ اس نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ جامع مسجد کی عمارت بہت بھاری ہو گی،

نئی بنیاد پر اپنی اونچی عمارت کا لے جانا خطرہ سے خالی نہ تھا، برسات کا پانی نیووں میں
مرتا اور اس کے ساتھ در و دیوار نیچے کھسکتے اور ڈھاتیں، کمانیں محرابیں جھک
جاتیں، سرکار کے لاکھوں روپے پر پانی پھر جاتا، اور میری آبرو کے ساتھ ساتھ
جان بھی جاتی، ایک نیتی اور مصلحت سے فدوی روپوش ہو گیا تھا، تین برساتیں
کھا کر نیو بالاٹ ہو گئی ہے۔ اب جو کچھ اس پر عمارت کھڑی ہو گی، صدیوں تک
کھڑی رہے گی، حضور کو اختیار ہے کہ فدوی کی جان بخشی ہو یا سزا دی جائے۔
بادشاہ نے انجینیر کے عذر کو غور سے سن کر اس کی خطا معاف فرمائی اور
خلعت سے سرفراز کیا۔ اور جامع مسجد نواب سعد اللہ خاں صاحب کے اہتمام
سے تیار ہونے لگی۔ جو نواب صاحب کو قولنج ہوا اور وہ جنت کو سدھار گئے، بہر
حال جامع مسجد، لال قلعہ اور شہر بن گیا۔ حضور والا نے دیوان خاص میں
تخت طاؤس پر جلوہ افروز ہو کر جشن ماہتابی منایا۔ اور ایک فرمان جاری فرمایا
جس کا خلاصہ یہ تھا کہ فخر البلاد جہان آباد عرف شاہجہان آباد میں جو رعایا آباد
کی گئی ہے اس میں خوش حال کم اور اہل حاجت زیادہ ہیں، پھر ان میں
کاریگر زیادہ ہیں مزدور ہیں، بیکار ہیں، عورتیں ہیں پردہ نشین جو برقعہ اوڑھ کر
کبھی باہر نہیں نکلتیں اور بغیر سودے سلف کے کام نہیں چلتا۔ اس واسطے میں حکم
دیتا ہوں کہ ترکاری فروش، گوشت فروش، میوہ فروش، پارچہ فروش، کسیرے
گندھی، آئینہ فروش، موچی، مٹی کے مٹکے، ٹھلیاں، صراحیاں بیچنے والے، [illegible]

اپنا دھن بیچنے والے، حلوائی، ابساطی، اپنے اپنے سامان خوانچوں میں لگا کر، گٹھریوں میں کندھے پر رکھ کر گلی گلی کوچہ کوچہ محلے محلے پھریں۔ اور اپنی اپنی جنس کا نام لیکر آواز لگائیں، بزاز کہے لٹھا، ململ، ڈوریہ، ململ۔ مچھلی والا مچھلی دریا کی لو ماچھ۔ کسٹ بنیے، بڑھئی، لوہار اپنے اپنے پیشہ کا نام لے کر پکاریں۔ یہاں تک کہ موری دھانے والے پکار کر کہیں کہ موری دھلوا لیجئے۔ تاکہ گھر بیٹھے اہل حاجت کی ضرورت رفع ہو جائے، چونکہ اس حکم تازہ کی تعمیل مشکل سے پیشہ ور کریں گے اس لئے کوتوالی کے برق انداز اُن لوگوں کے ساتھ ہیں، اور شہر میں گشت کروائیں، تاکہ گاہک اور سودا بیچنے والے اس طور کے لین دین کے عادی ہو جائیں اور بیچنے والوں کو نفع اور مول لینے والوں کو بازار جانا نہ پڑے، اور ہر قسم کی چیزیں اپنے دروازے پر لے لیں۔

جیسی نیت ویسی برکت، شاہجہاں بادشاہ کی یہ تدبیر ایسی راست آئی کہ آج اس اُجڑے دیار میں لینے والی بیٹی کا سارا جہیز اپنے گھر کے دروازہ پر کواڑ کی آڑ میں کھڑی ہو کر مول لے لیتی ہے۔ شاہجہاں کے بعد سلطنت درجہ بدرجہ منتقل ہوتی ہوتی محمد شاہ رنگیلے تک پہونچی، اور لال قلعہ کا دیوان خاص عیش نشاط کے سامان سے فردوس بریں بن گیا، معتمد الملوک سید ہاشم علی خاں حکیم رنگینی ذوق کے مددگار تھے اور ان کے حکم سے شترخانہ بادشاہی میں گرمی جاڑے برسات دو سو اونٹ بدست لگے جاتے تھے اور ان کے کانوں کے پیچھے کی مستی

دوا کے کام میں آتی تھی، میر شکار جنگلی کبوتروں کے بیس انڈے تازہ بتازہ اور بارہ انڈے چڑیا کے پیش کرتا تھا کیونکہ دونوں چیزیں مقوی ہیں۔ شراب پانی کی طرح لنڈھائی جاتی تھی، ایک رات محمد شاہ نشے کے سرور میں اس درگاہ کے اندر مع جوتیوں کے گھس گئے، جس میں حضور رسالت پناہ اور بزرگوں کے تبرکات، امیر تیمور کے عہد سے جمع کئے گئے تھے، یہ درگاہ لال قلعہ ہی میں تھی، اس بے ادبی اور گستاخی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کا زوال شروع ہوا، نادر شاہ آیا اور لال قلعہ کو اور شاہجہاں آباد کو اجاڑ کر چلا۔ یا اور بقول مومن سے

حسن روز افزوں پہ غرہ کس لئے ای ماہرو
یونہی گھٹتا جائےگا جتنا کہ بڑھتا جائیگا

مغلیہ سلطنت گھٹتے گھٹتے اور سکڑتے سکڑتے لال قلعہ کی چار دیواری میں ٹھٹھر کر رہ گئی۔ دانایان فرنگ کی تدبیر و شمشیر سے کوئی راجہ کوئی حاکم کوئی رئیس کوئی نواب عہدہ برآ نہ سکا۔ شاہ عالم بادشاہ نے فرنگیوں کو بیٹا بنا لیا۔ اُن کی دی ہوئی پنشن کو اللہ آمین کر کے قبول کر لیا۔ کیونکہ مرتا کیا نہ کرتا۔ جان بچی لاکھوں پائے، ایک شاہ عالم بادشاہ کے دل میں فرنگیوں نے گھر ہی نہیں کر لیا تھا بلکہ ہندوستانی عموماً انہیں اچھا جاننے لگے تھے، اور اُن کی سپاہ اور شاہراہ اور تنخواہ کی بچہ بچہ کی زبان پر تعریف تھی، یعنی فرنگیوں کی فوج جرار ہوتی ہے، دس ہزار پر ایک ہزار بھاری ہوتی ہے، شاہراہ یعنی کلکتہ سے جہاں تک

ان کی حکومت ہے پکی سڑک، اور سڑک کے ساتھ ریل اور ڈاک بھی اڑی چلی جاتی ہے۔ اور تین دن میں خط پتر ملک کے اِس سرے سے اُس سرے تک پہنچا دیتی ہے تنخواہ کی تعریف یہ ہے کہ جسے نوکر رکھتے ہیں اُس کا درمایہ یا طلب یا وظیفہ بے قال بے چون و چرا پہلی کی پہلی کو دے دیا جاتے ہیں، راجہ، مہاراجہ، نواب اور بادشاہوں کی سرکار سے نوکر کی تنخواہ تین تین برس نہیں ملتی تھی، اور نوکر کا گھرانہ کا گھرانہ فاقے کر کے برباد ہو جاتا تھا۔

ابو نصر معین الدین اکبر ثانی جب بیٹے کی منت پوری کرنے پھول والوں کی سیر منانے مہرولی حاضر ہوتے تھے تو عجب سماں تھا، بھکا رُت، ساون کا مہینہ بادشاہی خیمہ مخملی، باناتی، اطلسی، سبز، سُرخ، زرد، ریشمی، کلابتونی، سوتی طنابوں سے جکڑے کھڑے تھے اُن کے سنہری کلس اور شمسی سورج میں چمک رہے تھے اُوپر نیلا آسمان نیچے زمین پر سبزہ کا فرش اور خیموں کا سلسلہ اور جا بجا پانی میں ان کا عکس طلسمات کا عالم پیدا کر رہا تھا، بادشاہی خیمے سے لے کر حضرت قطب الدین صاحب بندہ نواز کی درگاہ شریف تک جہاں مستورات جا سکتی ہیں، دو رویہ قنات کھڑی تھی، کیونکہ ملکہ دوراں مرزا جہانگیر کو لے کر منت ادا کرنے کیلئے درگاہ میں حاضر ہوں گی، تیاری تو صبح سے ہو رہی تھی، مگر دن کے نو بجے ظل سبحانی نے کہا پنکھا چڑھانے کا وقت آگیا بس ملکہ دوراں نے پچاس خان اندر سے کی گوٹیوں اور

پھندوں کے آراستہ تھے، ایک چاندی کی کشتی میں سونے کا پنکھا جس میں پنّہ پکھراج
نیلم، یاقوت اور سچے موتی جڑے تھے جس کی بالشت بھر نیچی جھالر تو بیگم نے جوہی
کی کلیوں سے خود گوندھا تھا، مرزا جہانگیر کو دولہا بنا کر سہرا پھولوں کا بدھی طرّہ
عطر میں بسا کر اس کے سر پہ بندھوا کر وہ کشتی صاحب عالم کے سر پہ بسم اللہ کہہ کر
بیگم نے رکھی اور بادشاہزادے کی بلائیں لے کر کہا۔ اماں میرا منہ نہ تھا کہ تو
فرنگیوں کے چنگل سے نکل کر شاہجہان آباد میں آئے اور میں تجھے دیکھوں، یہ
سب حضرت کا صدقہ ہے جان من منت کی کشتی سنبھال کر اور سرا دے کے نیاز سے
جھکا کر درگاہ کو چلو۔ آقو غلاف شریف کی سینی بادشاہ نے اپنے سر پہ اور صندل
دان عطر دان، بیگم نے اپنے سر پہ اور مٹھائی کے خوان بادشاہزادوں نے
اپنے سروں پہ رکھ کر سب نے مل جل کر آستانہ پاک کی راہ لی۔ بیگمیں، اور
بادشاہ زادیاں ٹکڑوں جوڑے پہنے تھیں، گو کھروے جال سلمہ ستارہ،
کلابتوں کے تاش زری بوٹی زربفت کمخواب، زری ماجھ الماس، دلائی، بانات
بنارس، گجرات سورت، احمد آباد شریف، لاہور کے شاہی کارخانوں کے ریشمی اور
زرین کپڑوں کے لباس پہن کر آراستہ ہو رہی تھیں، لاکھوں روپے کا جڑاؤ گہنا
ہاتھ گلے میں تھا، پور پور نارنول کی مہندی رچی ہوئی تھی۔ ڈھیلے پائنچوں کو دو
لونڈیاں اٹھاتے چلتی تھیں تو دو باندیاں پیچھے دوپٹہ کو سنبھالے چلتی تھیں، آگے
آگے روشن چوکی اور نفیری بجانے والیاں سب عورتیں تھیں بیگموں کے جھانجن، چوڑیاں

اور پازیب کی جھنکار سے زندوں اور مُردوں کے دل کانپتے تھے، قنات در قنات یہ
سب درگاہ شریف پہنچے۔ باجے گاجے سب آستانہ کے باہر ہی ٹھہرا دیئے۔ ملکہ جہاں اور
سب عورتیں فرخ سیر والی جالیوں تک جا کر رک گئیں، اگرچہ ساری درگاہ کا زنانہ
ہو رہا تھا، عورتوں کیلئے ہمیشہ سے یہی حد ادب ہے، بادشاہ اور مرزا صاحب اور سب
مرد مزار شریف پر گئے اور پہلے غلاف پھر صندل چڑھایا، اور اوپر سے عطر لگایا،
پنج آیت پڑھی گئی، شیرینی تقسیم ہوئی نقد نذرانہ چھپری میں بھر دیا گیا، بادشاہ زادہ
کو قدمبوس کرایا اور سب حاجتی دعا کر کے قنات کے اندر پلٹ کر سراپردہ شاہی میں
داخل ہو لئے، رات کے کئی پہر بیتے بعد محلسرا میں ناچ گانا ہونے لگا، صحن میں کھم گڑے
تھے، ادھر بادشاہ زادیاں جھولے میں بیٹھیں اور گائنیں انہیں جھلانے اور یہ غزل
گانے لگیں۔

غزل

میری دل کی کلی میری جان جھولا — میری آرزو میرا ارمان جھولا
نہ جھولو بہت بیگمان جان جھولا — کہ دیتا ہے آخر کو نقصان جھولا
کروں کیوں نہ آؤ بھگت اس کی دل سے — مرے دل میں آیا ہے مہمان جھولا
جو ڈالی سے جو ٹوٹے کوئی لیے لیے — اُڑاتا ہے کیا میرے اوسان جھولا
یہ برسات کے پانچ تحفے ہیں بیگم — گھٹا، کوئلیاں، آم، پکوان، جھولا
دعا تیری لڑکی بڑی بے حیا ہے — نہیں چھوڑتی [illegible] نہ جھولا

رہے جا کے برسات میں قطب صاحب — اگر جھولنا ہے ہری جان جھولا
یہ موٹا یہ کھدّری یہ میلا کچیلا — کہاں سے اٹھا لایا دربان جھولا
خدا کے لئے آج پھر وہ سنا دو — جو گایا تھا کل تم نے بی جان جھولا
ہوا ختم ساون لگا آج بھادوں — جھلاؤ گی کب تم بجی جان جھولا
اگر جا دڑی یا دریبہ کو جائیں — مجھے لا کے دیں بھائی سلطان جھولا
بلایا ہے سمدھن کو جھولا جھلانے — بنے گا نہ کیوں کر پرستان جھولا
کنول دل کا کھل جائے ہو پیچ تازہ — جھلائیں جو مل کر خوش الحان جھولا
پھڑکتی ہے جب دیکھ لیتی ہے اسکو — کروں اپنی بچی پہ قربان جھولا
یہ بہنوں سے میری ملاتا ہے مجھکو — بڑا مجھ پہ کرتا ہے احسان جھولا
ٹھکی جاتی ہوں میں تو پڑھتے ہی پڑھتے — یہ ہے گیت یا کوئی دیوان جھولا

یہی اک ادا تو ہے ہندوستان کی
کیوں نہ جھولیں پھر ہندو مسلمان جھولا

پھول والوں کی سیر سے فارغ ہوکر بادشاہ شاہجہاں آباد میں تشریف لائے اور جشن کا حکم دیا اور فرمایا جشن سے پندرہ دن پہلے تورہ بندی کیجاتے، یہ رسم دلّی سے مٹ گئی اور نئی "ناتی" نے تورہ کا نام بھی کم سنا ہی، اس لئے فقیر فراق تورہ کے معنی عرض کرتا ہے، تورہ ترکی زبان میں قانون یا آئین کو کہتے ہیں، اسواسطے دہلی میں محاورہ بنا "شروع تورہ" یعنی شریعت اور قانون دونوں ایک بات مگر عورتیں اپنی بول چال میں

طنز کے طور پر تورہ غرور اور غصے کے معنی میں استعمال کرتی ہیں، مثلاً اللہ رے عورت تیرا تورہ" "لو بیو اپنا تورہ کسی اور کو دکھانا" "تورہ بیٹی"۔ دوسرے ترکی زبان میں تورہ کے معنی کھانے کے خوان کے ہیں، اور تورہ ان میں اُس کھانے کے خوان کو کہتے ہیں جو شادی بیاہ سے کچھ دن پہلے بطور حصہ بخرہ کے بھائی بندوں، عزیزوں دوستوں کے گھر بھجوائے جاتے ہیں، مغل بادشاہ ہندوستان میں فرمانروا ہوئے تو اُن کے ساتھ تورہ چنگیزی بھی آیا۔ بیاہ شادی سے دو ہفتہ پہلے تورہ بن گئے، نام بنام "تا کہ عین" تاریخ پر تقریب میں ہلڑ نہ ہو اور عزیزوں کو شکایت کا موقع نہ ملے کہ ہم بھوکے رہے، یا دسترخوان پر نہ بٹھایا، یا ہم دسترخوان پر بیٹھے تو تھے، مگر فلاں کھانا فلاں شے ہمارے آگے نہ تھی، ہماری توہین کی گئی۔ اس لئے تورہ کے کھانوں کی فہرست لکھ کر کنبہ خاندان میں بھیجدی جاتی تھی۔ اُس کے مطابق لینے والے تورہ لے لیں۔ ایک گھر کے دس تورہ ہیں تو وہ دسوں تورہ ایکدن میں لے سکتے ہیں اور دل چاہے تو دس دن میں لے لیں، پھر تورہ کی قیمت بھی تشخیص کردی جاتی تھی، چاہے لینے والے نقد لے لیں۔ ایک منشی مع دوات قلم کے اور پانچ خادموں کے تورہ کے ساتھ ہو لیتا۔ ایک تھیلی روپے کی بھی اُس کے ہمراہ ہوتی تھی۔ اسکے ذمہ پچاس تورہ ایکدن میں تقسیم کے لئے ہوتے، رسید لے لیتا تھا، تورہ دے دیتا تھا، جو نقد لینا چاہتا اسے نقد دیتا تھا۔ ہر تورہ ایک کہار کی بہنگی میں ہوتا تھا، تورہ جو ادنیٰ قسم کا ہوتا اُس کی قیمت پانچ روپیہ ہوتی تھی، تورہ کا کھانا مٹی کے لاکھی برتنوں میں عموماً ہوتا تھا۔ تورہ کے کھانوں کی تفصیل یہ تھی۔

ایک لکڑی کے رنگین خوان میں سب پہنچے۔

(۱) باقرخانیاں ڈھائی سیر پختہ کی دو عدد (۲) قورمہ کے دو پیالے، ہر پیالہ میں کم سے کم آدھ سیر قورمہ (۳) کباب شامی پانچ عدد (۴) بریانی دو طباق۔ (۵) متنجن دو طباق۔ (۶) فیرنی دو پیالہ، ہر پیالے میں آدھ سیر (۷) مربہ آم وغیرہ ایک پیالی (۸) اچار کسی قسم کا ایک پیالی۔ (۹) دہی آدھ سیر ایک پیالہ (۱۰) گاؤ زبان دو عدد۔ (۱۱) گاؤ دیدہ دو عدد۔ (۱۲) نان تنوری یعنی آبی روٹی دو سیر کی چار عدد۔

یہ سب کھانے مانڈوں سے ڈھکے ہوتے تھے، مانڈہ اُس باریک اور روغنی چپاتی کا نام ہے جو شب برات کو پکتی ہیں۔ ایک مثل بھی مانڈوں کے متعلق مشہور ہے "مُردہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں اُنہیں اپنے حلوے مانڈے سے کام" یہ معمولی تورہ ہے، ورنہ بادشاہوں کے تورہ ہزاروں نعمتوں کے سونے چاندی اور چینی کے برتنوں میں کئی ہوتے تھے۔ اس رسم کو بادشاہوں سے دلی والوں نے بھی سیکھ لیا تھا اور شہر میں بھی تورہ بندی ہوتی تھی۔ مگر غدر ۱۸۵۷ء کے کچھ دن بعد سے موقوف ہے، اب تو ٹی پارٹی کی گرماگرمی ہے۔

ختم شد

LYTTON LIBRARY ALIGARH
مکتبہ انوار ۔۔۔ نمبر ۲۴۲